سمن مچھانوی ایم۔ اے

بڑا دائرہ

(خیالی باتوں کا مجموعہ)

آزاد بک ڈپو۔ امرتسر

سمّن مچھانوی ایم اے

بڑا دائرہ

خیالی باتوں کا مجموعہ

آزاد بک ڈپو امرتسر

اشاعت اوّل : سنہ ۱۹۹۲ء

تعداد : ۱۰۰۰ ایک ہزار

قیمت : ۳۰/- تیس روپے

خوشنویس : سید وسیم احمد عجب شیر تیماپوری محلہ احمدیہ قادیان

مطبع : خواجہ پریس جامع مسجد دہلی

پروف ریڈنگ : سردار بدن سنگھ پنر

: پیشکش :

آزاد بک ڈپو ہال بازار امرتسر

ملنے کا پتہ : چمن چھانوی - ایم اے ۱۶۳/۱۶۶ بازار نمبر ۱ - فیروز پور چھاؤنی

گفتنی

ے جہاں کی شکل بدل ڈالتے ہیں اثر ترا سر پہ کچھ ایسے لوگ بھی پیدا جہاں میں ہوتے ہیں

یہ شعر یُوں تو کسی نیتا یا رہنما پر صادق آتا ہے مگر مجھے اِن کے بھائی سکھدیو شرما ایم اے کے ایک دلچسپ فقرے نے متاثر کیا ہے۔ وہ اِن کے اولین افسانوی مجموعہ "باون افسانوں" کے تعارف میں لکھتے ہیں کہ سُمن چھانوی صاحب پولیس میں تقسیم وطن کے بعد ملازم ہو گئے۔ لوگ پولیس والوں سے ہمیشہ یہی تاثر لیتے ہیں کہ وہ سخت گیر ہونے کے علاوہ خود پسند بھی ہوتے ہیں۔ مجھے اُن کے بھائی کا یہ فقرہ پڑھ کر حیرت نہیں ہوئی۔ کیونکہ اگر پولیس والے اکڑ فوں نہ دکھائیں تو انتہا پسند لوگ عوام کا جینا مشکل کر دیں۔ مگر یہ قول ہر پولیس والے پر صادق نہیں آتا پولیس میں ایسے افراد بھی ہیں جو بہت نیک منش اور رحم دل ہیں۔ میں جناب سمن چھانوی صاحب کو ذاتی طور پر بطور پولیس ملازم بھی جانتا ہوں۔ جب وہ کوتوالی امرتسر میں بطور ڈی۔ ایس پی تعینات تھے۔ اور اس زمانہ میں جبکہ انتہا پسندی کا رجحان بھی عام تھا اِن کو نوجوانوں سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ اِن لوگوں سے ایسی لجاجت آمیز اصلاحی باتیں کر کے اِن کو راہِ راست پر لے آتے تھے۔ جو کسی سزا سے بھی زیادہ سود مند ثابت ہوئی ہیں۔ اور اپنی دلنوازی سے اُن کو تو یہ پر مجبور کر لیتے تھے۔ کیونکہ اصلاح کچھ اور چیز ہے اور سزا کچھ اور چیز آپ کو امریکہ کی لائبریری میں قانون پر لاکھوں کتابیں پڑھنے کو ملیں گی لیکن ان سے کسی کی اصلاح ممکن نہیں۔ اصلاح تو سُمن چھانوی ایسے ہر دلعزیز اور باوقار انسان کے دو فقروں سے

ہو جاتی ہے۔ جو عوام کے دلوں میں اُتر کر ہمیشہ جرم سے باز رہنے کی تلقین دیتے ہیں۔ یہی حال میں نے اِن کے افسانوں میں دیکھا ہے۔

پہلے مجموعے "باون افسانوں" میں تقریباً ۵۹ کہانیاں ہیں۔ جو پڑھے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بڑے سے بڑا پتھر دل انسان بھی اِن کی کہانیاں اور افسانے پڑھ کر دل میں داد محسوس کرنے لگتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ وہ پولیس ایسی ملازمت میں اِن افسانوں کے لئے کیونکر فرصت نکال لیتے تھے۔ مگر بقول شری سُکھدیو شرما رشک ان کو افسانوں کے عنوان یا کردار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ گھومتے پھرتے کہانیوں کا مواد حاصل کر لیتے ہیں۔ ان کی نگاہ ہر وقت افسانوی شہ پاروں کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ وہ جو افسانہ یا کہانی لکھتے ہیں وہ صحیح اور سچے واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ کیونکہ اُن کے افسانے انسانی اصلاح اور سچے سماجی جمالیات کی روشنی میں لکھے گئے ہیں۔ الفاظ اور محاورے بھی ایسے خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ان کا نیا مجموعہ جو میری نظر سے گزر چکا ہے۔ ایسا ہے جس کے متعلق میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ اچھے سے اچھا افسانہ نگار بھی ان سے زیادہ تاثر پیدا نہیں کر سکتا بطور اقبال ؎ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے"

مصنف کے قائم کئے ہوئے عنوانات تک پہنچنے کے لئے بڑی کاوش اور ذہنی دریافت سے کام لینا پڑتا ہے۔ جو بڑا مشکل ہے۔ اور بے تعصب رائے کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ جناب کمن پھانوی صاحب جانے پہچانے افسانہ نگار ہیں۔ مجھے ان کے افسانوں کے انداز بہت پسند آئے ہیں۔ کہ متنوع مطالب پر اُن کا قلم حاوی ہے۔ اور ادائے مطلب میں انہیں کہیں بھی دشواری کا سامنا کرنا نہیں پڑتا۔ زبان اتنی سادہ اور اندازِ بیان اتنا واضح ہے کہ عام قاری

بھی اِس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

دوسری بات مجھے اُن کی یہ بہت پیاری لگی کہ وہ مغرب سے مرعوب نہیں ہوئے میں اُن کے قلم کی شانِ دلربائی سمجھتا ہوں۔ کہ انہوں نے عام طبقے کو مخاطب کر کے نفسیات، حیاتیات اور تمدن کے عنوانات پر قلم اٹھایا ہے۔ موجودہ زمانے کے گہرے فکری نقوش بھی ان کی کہانیوں میں ملتے ہیں۔ جو بہت دل چسپ ہیں۔ ان کی ہر کہانی میں مقامیت کا رنگ جھلکتا ہے کیونکہ کوئی بھی شخص اپنے ماحول سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ پھر ان کی اعلیٰ تعلیم اور اعلیٰ شخصیت سائنسی دور میں ایک ممتاز حیثیت کی حامل ہے۔

سترہویں صدی میں ہندوستان میں اُردو مثنویاں لکھنے کا بہت رواج تھا۔ مثنوی سیف الملوک اور بدیع الجمال مصر کے شہزادے اور چین کی شہزادی کی داستان ہے اور ابنِ نشاطی کی پھول بن بھی ایک عشقیہ کہانی ہے۔ اِسی صدی میں وجہی کی سب رس ہے۔ مگر نثر میں۔ اِس کے علاوہ کسی اور قصّے کا پتہ نہیں چلتا۔ انیسویں صدی کے شروع میں کلکتہ فورٹ ولیم کالج میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہوا تو اس زمانے میں میر امن کی باغ و بہار بہادر علی حسینی کی نثر بے نظیر۔ حیدر بخش کے قصّے لیلیٰ مجنوں۔ طوطا کہانی۔ آرائشِ محفل۔ نہال چند لاہوری کا قصہ تاج الملوک بکاولی اور بیتال پچیسی آج بھی مشہور ہیں۔ سیاسی تحریکات کے زیرِ اثر افسانوں کی بھی کئی نئی اقسام ہیں مثلاً جاسوسی، ہیبت ناک رومانی وغیرہ وغیرہ۔ اب پرانی چیزیں مٹتی جا رہی ہیں۔ اور اُن کی جگہ نئے اور جدید تجربات ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ کیونکہ سائنس نے انتہا درجہ ترقی کی ہے۔ فاصلوں کی دوری ہوائی جہازوں نے مٹا کر رکھ دی ہے۔ سیاسی دنیا کے دوش بہ دوش ملک میں معاشی اور فکری زندگی بھی بدل چکی ہے۔ اِن کا ہمارے ادب

پر بھی اثر پڑا ہے۔ اب وہ پہلی سی زندگی اور رہن سہن نہیں رہا۔ مُحسن پھانوی صاحب نے اپنی کہانیوں اور اپنے افسانوں میں نئے تجربات اور نئے نظریوں سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی کہانیوں میں جمالیاتی رنگ اور پختگی پائی جاتی ہے۔ اور زندگی کی مستقل قدروں کا احساس بھی ان میں ملتا ہے
واقعات کلچر اور تجربہ خالص پنجابی ہے طرز بیان سادہ آسان اور ادبی ہے
ان کے افسانوں میں ایک خاص بات یہ ہے۔ کہ کہانی کے خاتمے پر پُر اسرار طلسمی انداز بھی نمایاں ہے۔ اور یہ طرز آج کل محبوب بھی ہے۔ کیونکہ اِن میں حقیقت کی عکاسی ہے۔ نہ کہ تخیلی اور شاعرانہ۔ افسانوں کے کرداروں میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہ ایسی خصوصیات ہیں جو اِن کو دوسروں سے ممتاز بناتی ہیں۔ اِس سے ثابت ہوتا ہے کہ اِن کا مطالعہ عمیق تر ہے دعا ہے کہ اللہ اِن کے مجموعے کو شہرتِ دوام دے۔

پورن سنگھ ہُنر

وہ لہ رہ کر مایا کے نقش پا کو چومتی رہتی۔ رات کی سیاہ چادر پہنتے ہی وہ اپنی کالی کانوں کی جھونپڑی میں دیا جلا کر دال بھات تیار کرنے شروع کر دیتی۔ ایسا کرتے وقت وہ دھیرے دھیرے نہایت شیریں آواز میں گاتی رہتی

سیاں دیر بھئی اب آجا
توری راہ تکوں اب آجا

اس کی سریلی آواز جھونپڑی سے دس قدم بھی آگے نہیں جاتی تھی۔ جب اس کے دال بھات تیار ہو جاتے۔ تو شہر کی طرف سے آنے والی پگڈنڈی پر شنکر کی آواز گونج اٹھتی ہے۔

میں تو آیا ری دلھنیا آیا
تورے پیار بہت ترپایا

اور پھر شنکر کی آواز قریب ہوتی جاتی۔ شنکر کے راگ میں مست ہو کر مایا اپنے بول اور اپنے آپ کو بھول کر شنکر کے سر میں اپنا سر ملا لیتی۔ اور جب وہ جھونپڑی میں داخل ہونے لگتا تو اس وقت دونوں کے ملے جلے سروں میں ایک ہی نقرہ بنتا۔

تورے پیار بہت ترپایا

پھر شنکر کے جھوروں جیسے ہاتھ مایا کی نازک کلائیوں کو جکڑ لیتے۔ مایا خود بخود شنکر کی طرف جھک جاتی۔ شنکر اس کے بالوں کی سیاہ گھٹاؤں میں اپنا چہرہ ڈبو دیتا۔ اسے جی بھر کر پیار کرتا۔ اور اس طرح دونوں کی تکان دور ہو جاتی۔ ان کی جھونپڑی کے پاس کچھ اور مزدور بھی رہتے تھے۔ کوئی رکشا چلانے والا اور کوئی سڑک بنانے والا۔ رات کو سبھی دن بھر کی محنت سے تھکے ہارے اپنی جھونپڑیوں میں آرام کرتے۔ ان جھونپڑیوں کے نزدیک شہر کے کارخانوں کا گندہ پانی ایک جھیل کا نظارہ پیش کرتا تھا
کالے تیل کی آمیزش سے یہ گندہ پانی نیلگوں رنگت اختیار کر گیا تھا۔

اس سے نہایت گندی بو اٹھتی تھی۔ مگر رات کی تاریکی میں آسمان کے چاند ستارے اس جھیل میں اتر آتے تھے۔ جھینگروں کی چرچراہٹ اور بطخوں کی بڑبڑ ایک عجیب سماں باندھ دیتیں تھی۔ جھونپڑی والوں کی سیرگاہ یہ گندی جھیل ہی تھی۔ جو اداس ہوتا اس کے کنارے بیٹھ کر اپنے غم اس میں ڈبو دیتا۔ ملک آزاد ہوئے چالیس سال بیت چکے تھے۔ بلاشبہ بڑے بڑے سرکاری ایوان ہزاروں میل لمبی سڑکیں ریل کی پٹریاں اور نہریں بن چکی تھیں۔ ان کے علاوہ رفاہ عام کے سینکڑوں کام ہوئے تھے مگر غریبی کی جڑیں کافی گہری تھیں۔

بڑے بڑے ڈیموں اور باندھوں کے پانی بھی انہیں نہ گلا سکے۔ بجلی کی بڑی بڑی اسکیمیں اور پلانٹ انہیں نہ جلا سکے۔ بلکہ بہترین انسانی دماغ بھی امیری اور غریبی کے فرق کو نہ مٹا سکے۔ امیر تو اور امیر ہوتے ہیں ۔ جبکہ غریب جان توڑ محنت کے باوجود غربت کی عمیق کھائی میں گرتے گئے۔

ضروریات زندگی روز بروز بڑھتی گئیں۔ عام چیزوں کے بھاؤ آسمان کو چھونے لگے۔ اشیاء خوردنی پنکھ لگا کر اڑنے لگیں۔ کپڑے کو آگ لگ گئی۔ کنبہ کے سبھی افراد سارا سارا دن لہو پسینہ ایک کر کے محنت کرتے مگر پھر بھی پیٹ کی دوزخی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی ۔ کوئی جاتا تو کہاں جاتا۔

شنکر اور مایا بھی ایسے ہی محنت کش لوگوں میں سے تھے۔ جی جان سے محنت کرتے مگر پھر بھی روٹی نہ ملتی ۔ اس پر بھی وہ خوش تھے ۔ صبح شام بھگوان کو یاد کرتے تھے ۔ اس عذاب کو اپنے پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل سمجھ کر برداشت کئے جا رہے تھے ۔ بیچارے ہندو جو تھے۔

اس جوڑی نے بھی تین چناؤ دیکھے تھے۔ ان کی جھونپڑی کے تلے بھی کاریں

رکی تھیں۔ ان کے نام بھی فہرست رائے دہندگان میں شامل تھے۔ انہیں بھی سر چھپانے کے لئے پختہ مکان دینے کے وعدے کئے گئے تھے۔ مفت تعلیم اور علاج معالجے کی سہولت دینے کو بھی کہا گیا تھا۔ انہوں نے بھی تین بار ہولی دیوالی پر پہنے جانے والے لباس زیب تن کر کے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ کسی کو کامیاب کیا تھا۔ مگر ان کی وجہ سے کوئی ہار بھی گیا تھا۔ کامیاب ہونے والا اکثر انہیں بھول جاتا تھا جب کہ ہارنے والے ان کے بیر پڑ جاتے تھے۔ وہ انہیں غربت کے کنوئیں سے نکلنے نہیں دیتے تھے۔ اپنی بد قسمتی سمجھ کر وہ چپ رہتے۔ کسی سے گلہ شکوہ نہیں کرتے۔ کیونکہ غریبوں کی شنوائی کسی جگہ بھی نہیں تھی۔ "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ تو ووٹ حاصل کرنے کے لئے ایک ہتھیار تھا۔ ملک میں کروڑوں شنکر اور مائیا میں غربت کی سطح سے نیچے گرتے گئے۔ بیچارے بد قسمتی کے مارے۔ غربت کے دُلارے۔

شنکر اور مایا کی شادی ہوئے پندرہ برس بیت چکے تھے مگر ان کے گھر اولاد نہ ہوئی۔ انہیں اس بات کا کوئی فکر نہیں تھا۔ انہوں نے کوئی دوادارو نہ لی۔ کسی کے طعنوں مہنوں کی پرواہ نہ کی۔ غصہ نہ کیا۔ انہیں اولاد کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ انہیں ممی ڈیڈی کہلوانے کا شوق بھی نہ چرایا۔ احباب وغیرہ کے سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ درحقیقت انہوں نے بھگوان شنکر کے قدموں میں بیٹھ کر قسم کھائی تھی کہ وہ کبھی ماں باپ نہیں بنیں گے۔ غریبوں کی تعداد میں ایزادی نہیں ہونے دیں گے۔ اور بیکار بچے پیدا کر کے رائے دہندگان کی گنتی نہیں بڑھائیں گے۔

آخر شو بابا نے ان کی دعا کو قبول کر لیا۔ انہوں نے خاندانی منصوبہ بندی کیمپ میں جا کر اپنا اپنا اپریشن کروالیا۔ اور ایک مہینے کے راشن کے لئے رقم حاصل کر لی۔ اب ان کی غریبی بڑھانے والی جڑیں کاٹ دی گئی تھیں۔ لہذا انہوں نے کسی دوسرے غریب کو پیدا نہیں کیا۔

شنکر اور مایا بوڑھے ہو گئے۔ محنت کشوں کی کوئی پنشن تو ہوتی نہیں۔ وہ بالکل ناکارے ہو گئے۔ ان کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ان کی جڑوں سے کونپل نہ پھوٹی۔ کیوں کہ وہ کٹ کر بے جان ہو چکی تھیں۔ وہ دونوں غریب ہی مر گئے۔ چونکہ انہوں نے آئندہ کسی غریب کو پیدا نہ ہونے دیا۔ اس طرح غریبی مر گئی۔

کپتان لاٹو رام

شری لاٹو رام ولد چھٹا پو رام ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس میں کھیل کود کا شوق بچپن سے ہی پیدا ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ شری لاٹو رام بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ بچپن سے ہی وہ لاٹو کی طرح گھوم جایا کرتے تھے۔ داد دینی چاہیئے ان کے والد بزرگوار کی عقل کی جنہوں نے یہ نام دیا تھا۔ خود چھٹا پو رام صاحب کا نام بھی ایک مشہور کھیل چھٹا پو پر ہی رکھا گیا تھا۔ اور اگر شجرہ نسب کو تھوڑا اوپر سے دیکھا جائے تو سیٹھ رہڑا مل کپتان لاٹو رام کے دادا ٹھہرتے تھے۔ رہڑا بھی ایک دیہاتی نام ہے جو عام طور پر کسی گول چکر پہیے کو کہا جاتا ہے اور بچے اسے چھڑی یا کسی آہنی تار کی مدد سے چلاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی خود بھی بھاگتے ہیں۔ اس طرح یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ لاٹو رام ایک نامور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آبائی پیشے کے لحاظ سے وہ بنیئے تھے جن کے خون میں بے ایمانی سرخ ریزوں کی طرح موجزن تھی۔

لاٹو رام جی نے جب بی اے پاس کیا تو انہیں مختصر نویسی اور ٹائپ رائٹنگ کا کورس کروایا گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ وہ قد و قامت میں بہت چھوٹے تھے۔ بد قسمتی سے بچپن میں پالنے سے گرنے پر ان کے ایک کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس سے شانے بے ترتیب اور بے ڈھنگے سے ہو گئے تھے۔ شری چھٹا پو رام جو ایک انگریز انسپکٹر جنرل کے پاس ہیڈ کلرک تھے نے مل ملا کر انہیں سٹینو گرافر بھرتی کرا دیا۔ ایک بار سرکاری ملازمت میں آنے کے بعد

شری چھٹا پورام نے تقسیم وطن سے تھوڑا پہلے اس فرنگی صاحب سے لاٹورام کو محکمہ جیلخانہ جات میں داروغہ کے عہدہ پر مقرر کروادیا۔ اور مختصر سی تربیت کے بعد خاکی وردی اور طرہ دار پگڑی پہنوادی۔ شری لاٹورام جواب دیوان لاٹورام کہلاتے تھے داروغہ کے عہدہ کے نشے میں رہنے لگے۔ اس کبڑے بنئے کے سر پر طرہ دار پگڑی ایسے معلوم دیتی تھی جیسے کسی پچکے ہوئے کنستر پر مرغہ بیٹھا ہو۔ مگر جناب وہ تو داروغہ صاحب تھے اور وہ بھی انگریز افسروں کے منتخب شدہ۔

تقسیم وطن کے بعد بہت سے سرکاری ملازمان جو مسلمان تھے پاکستان چلے گئے تھے۔ اس ہجرت کا سب سے زیادہ اثر محکمہ جات پولیس اور جیل پر ہوا۔ کیوں کہ بیشتر افسران مسلمان ہی تھے۔ اس طرح بچے کھچے ہندو سکھ افسران کی ترقیاں ہوئیں اور عہدے بڑھے۔ دیوان لاٹورام دنوں میں ہی پگڑی چھوڑ کر پی کیپ پہننے لگے۔

لاٹورام اب محکمہ میں بھی گھومنے لگے۔ وہ ایک حکم دے کر یا تو جان بوجھ کر بھول جاتے تھے یا پھر جہاں انہیں خود پر ذرا بھی بوجھ محسوس ہوتا کھسک جاتے۔ ان کی یہ شاطرانہ چال بہت مشہور ہو چکی تھی۔ وہ خود بھی فخر سے کہا کرتے تھے کہ اس معاملہ میں ان سے کوئی سبقت نہیں لے جا سکتا تھا۔ عوام سے وہ افسرانہ برتاؤ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ ان کی شخصیت بالکل غیر موثر تھی۔ اس لئے کپتان بننے کے بعد انہوں نے صرف ایک بار فوٹو کھنچوانے کے لیے وردی پہنی۔ باقی سروس کے دس برس دفتری زندگی میں ہی گزرے۔ وہ ڈیوڑھی منشی سے لیکر ہیڈ کلرک تک ہر کام جانتے تھے۔ نام کو وہ کپتان صاحب تھے۔ مگر کام ساری عمر کلرکی کا ہی کرتے رہے۔ آخر گزٹ شدہ افسر تھے ایک علیحدہ دفتر اور میز کرسی تو ملنے ہی تھے۔ کرسی پر وہ اس اکڑ سے جلوہ افروز ہوتے تھے گویا وہ ہی بھگوان ہوں۔ کہا کرتے تھے کہ انتظامیہ معاملات میں وہ ماہر ہیں۔ کرسی پر وہ اس طرح بجتے تھے جس طرح لبرے جانے والا بندر گھٹلی پر بیٹھتا ہے۔

لاٹورام صاحب خود کو ایماندار بتلاتے تھے۔ کیوں کہ انہوں نے کسی قیدی سے کسی سلسلہ میں کوئی ماسہ الاقنطاط حاصل نہیں کیا تھا۔ البتہ کپتانی میں انکا راشن فری رہا۔ بھنے چنے۔ سبزیاں اور

خشک رسد انہیں جیل سے مل جاتے تھے۔ بس کا سفر فری اور سینما رعایتی ٹکٹ پر دیکھتے تھے۔ اس طرح وہ سالم تنخواہ بچانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ اخبار بینی کے بہت شوقین تھے مگر آج تک انہوں نے گرہ خود سے کوئی اخبار یا رسالہ نہیں خریدا تھا۔ اول تو سرکاری لائبریری کے اخبارات پر ان کا حق اولین تھا دوسرے انہیں رسائل وجرائد مانگ کر پڑھنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ان کے خیال میں اس طرح ادبی دوستوں سے تعلقات پختہ ہوتے ہیں۔

لاٹورام نے جیل میں آنے والے کسی ملازم یا ملزم کو معاف نہیں کیا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے کچھ نہ کچھ اینٹھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک کلو چینی یا چاول تک قبول کر لیتے تھے۔ ایسے تحفے تحائف قانون کی زد میں نہیں آتے تھے مگر لاٹورام صاحب کا دانہ دنکا چل جاتا تھا۔ ملازمان کو جب کبھی سفر خرچ یا انعام منظور ہوتا تھا تو وہ انہیں کوئی نہ کوئی بیگار ضرور تھا دیتے۔ ان کا فرمان تھا کہ اگر وہ بل پر سفارش ہی نہ کرتے تو رقم منظور کیسے ہوتی۔ اس لیے ایسی رقوم میں وہ برابر کے حصہ دار تھے۔ بلکہ وہ اپنا حق فائق سمجھتے تھے۔

بدوضع۔ بدشکل بدکلام اور بد اخلاق ہونے کے باوجود کپتان لاٹورام اپنے آپکو اشرف المخلوقات سمجھتے تھے۔ ان کی بیوی جو کہ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتی تھی ان کے رویہ سے سخت نالاں تھی۔ مگر وہ جیلر کے پاس سزا بھگتنے کو پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے اس خدا کی بندی نے کبھی لب سے لب نہ اٹھایا۔ لاٹورام جی اپنی اہلیہ محترمہ کو ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ازدواجی زندگی میں وہ جسمانی کمزوری کے باعث کامیاب نہ ہوئے۔ ان کی سرو قد بیوی اس بونے بننے کی بطور بھگوان پوجا تو ضرور کرتی رہی مگر پیار کے معاملہ میں وہ ان سے دور ہی رہی دراصل وہ ان سے پیار کر کے اپنے حسن وجمال کی توہین نہیں کروانا چاہتی تھی یہی وجہ تھی کہ ان کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

ایک بار جیل میں ایک سیاسی قیدی نے ایک درخت سے لٹک کر خودکشی کر لی۔ وہ قیدی کپتان لاٹورام کی براہ راست نگرانی میں دیا گیا تھا۔ وہ اس قیدی کو درخت پر مردہ لٹکتے دیکھ

گزار دقطار رونے لگے۔ ماتحتان نے لاکھ سمجھایا کہ وہ ایک قیدی تھا۔ اگر اس نے خودکشی کی ہے کارروائی ضابطہ کروائی جائے اس میں رونے کی کیا بات تھی۔ مگر کپتان صاحب نے روتے ہوئے کہا کہ وہ بھی متوفی کے ساتھ کسی قسم کی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ بس یہی سوچ کر رو رہے تھے کہ وہ اسے اس اونچے درخت سے کیسے اتاریں گے۔ ان کی اس بات پر خوب مذاق اڑا۔ ماتحتان نے قیدی کی نعش نیچے اتار دی۔

ایسے ہی ایک بار جیل میں قیدیوں نے سٹرائک کردی۔ بات بگڑتی گئی اور قیدیوں اور ملازمان جیل میں ہاتھا پائی تک کی نوبت آگئی۔ دونوں اطراف جسمانی چوٹیں پہنچیں۔ بالآخر ضلع پولیس کی مدد سے معاملہ فرو ہوا۔ باغی قیدیوں کو باری باری کپتان صاحب کے پیش کیا گیا۔ انہوں نے اس معاملہ میں بھی ہاتھ رنگ لئے۔ ایک طرف کرمچاریوں کو انعامات دلوائے اور ان سے اپنا حصہ حاصل کیا اور دوسری طرف قیدیوں کو معمولی سزائیں دینے کا وعدہ کر کے ان کے رشتہ داروں سے کسی نہ کسی ڈھنگ سے فائدہ اٹھایا۔ ادھر انتظامیہ میں ان کی حکمت عملی کی تعریف ہوئی۔ گویا ہر کروٹ پر ان کے پوں بارہ ہی رہے۔

ملازمت سے ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ پہلے ہی انہوں نے ماتحتان اور قیدیوں سے تحفے تحائف حاصل کرنے کی بات پکی کرلی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جس روز انہیں جیل کی چار دیواری سے مستقل طور پر مخلصی ملی انہیں ماتحتان کی طرف سے ایک پیتل کا گھوڑا پیش کیا گیا۔ جب کہ قیدیوں نے مل کر ایک مصور قیدی سے انکی قدآدم تصویر بنوائی۔ مصور تو فطرتاً ایماندار ہوتے ہیں۔ اس جیل میں مقید مصور نے بھی ان کی شکل ہو بہو تیار کی اور ان کے چہرہ پر مسکراہٹ کی بجائے تیوری دکھلائی آخری وقت اس میں رد و بدل بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کپتان صاحب نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی وہ تصویر اپنی اہلیہ محترمہ کو دکھائی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی بیگم کے منہ سے نکل ہی گیا کہ کم از کم تصویر میں تو انہیں مسکراتا دکھلانا چاہئے تھا۔ یہاں بھی کپتان صاحب نے فوراً جواب دیا کہ حاکموں کی تصویریں چہرہ پر غصہ ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ اس سے رعب بڑھتا ہے۔ ان کی بیگم منہ بسور کر رہ گئی۔

ایسے تھے انگریزی حکومت کے حاکم جنہیں شکل کی ضرورت تھی نہ وجود کی۔ نہ معلوم اب وہ حیات ہیں یا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ مگر جیل کے دفتر میں اُن کا نام بورڈ پر زندہ وتابندہ رہے گا۔

بے زبان مدعی

سورج غروب ہوئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا۔ ابھی زمین میں جذب ہوئی گرمی بھی بے چین کر رہی تھی۔ گاؤں کے لوگ مویشیوں کو پانی پلا کر اور خود نہری پانی میں نہا کر اپنے گھروں میں داخل ہوئے ہی تھے۔ ہر گھر میں مویشیوں کو چارہ ڈال دیا گیا اور لوگ شام کا کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ پر حیرانی کی بات یہ تھی کہ ہر گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ آخر کیوں؟ باہر سے آنے والا اجنبی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ کیا اس گاؤں میں دیو حملہ کرتا تھا یا کوئی چڑیل بچے اٹھانے آتی تھی۔ وہ کون ڈر تھا کہ گاؤں کے کتے بھی بھونکنا بند کر دیتے تھے؟

بند دروازوں والے ایسے گاؤں میں کبھی کبھار پولیس اور سی آر پی کی گاڑیاں گشت کے لئے ضرور آتیں مگر گاؤں کا کوئی بشر ان پولیس والوں سے بھی نہ ملتا۔ اونچی آوازیں اور دروازوں پر زور زور کی دستکیں بھی بے اثر ثابت ہوتیں۔ لوگوں پر ایک عجیب خوف طاری تھا ایک نہ بیان ہونے والا سہم اور ایک دل ڈبونے والا ڈر۔ پولیس والے گاؤں کی سنسان گلیوں میں گھوم کر واپس چلے جاتے۔ اتنی گرمی میں بھی لوگ مکانوں کے اندر دبکے بیٹھے تھے۔ کیا وہ سچ مچ سو رہے تھے یا سہمے ہوئے خاموش تھے؟

پھر گاؤں میں گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ لوگوں کے دلوں کی دھڑکنے بھی قریب قریب ساکن تھی۔ کسی بچے بوڑھے کے رونے یا کھانسنے تک کی آواز کانوں میں نہیں پڑتی تھی۔

چار گھوڑ سوار سر پر پیلے پٹکے باندھے ایک خاص گلی میں داخل ہوئے۔ ایک پرانے شو مندر کے پاس انہوں نے گھوڑے باندھے اور برق رفتاری سے ایک ساتھ والے گھر کی دیوار کود کر صحن میں داخل ہوئے۔ گھر میں اس وقت ایک بوڑھا براہمن موجود تھا جو اپنی ڈھیلی سی چارپائی میں پھنسا دل ہی دل میں اپنے اشٹ (معبود) کو یاد کر رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر برآمدے میں اس کی دو بہوئیں اپنے چھوٹے بچوں کو چھاتیوں سے چپکائے سانس روک کر چار پائیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان چار لمبے چولوں والے نوجوانوں نے اول اس بوڑھے براہمن پر چینی اساٹ رائفلوں سے بیک وقت فائر کئے۔ وہ بوڑھا بنا کچھ بولے راہی ملک عدم ہوا۔ پھر ان میں سے دو ان عورتوں کی طرف بڑھے اور دوسرے دو دیوار کی آڑ میں رائفلیں تانے کھڑے ہو گئے۔ بچاری عورتوں کے ہاتھ پاؤں خوف کے مارے پھول چکے تھے۔ جیسے جی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ لب سل چکے تھے۔ ان کی گودوں میں معصوم بچے بھی جیسے پتھر مٹی کے کھلونے بن چکے تھے۔ کسی کے سانس لینے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ ابھی تک چینی رائفلوں سے ہوئے فائروں کی آواز فضاء میں گونج رہی تھی۔ سارا گاؤں جیسے قبرستان بن چکا تھا۔ درختوں پر بیٹھے پرندے بھی اڑنے اور بولنے کی ہمت نہ کر سکے۔ پھر ان لمبے چولے والوں نے اپنی رائفلوں کی نوک کا رخ ان پتھر بنی عورتوں کی طرف کیا۔ "کتھے نیں تہاڈے چرن داس۔ گنگو دے پت؟ عورتوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی اشارہ نہ کیا۔" حالی تیک تسیں ایتھوں دفع کیوں نہیں ہوئے۔ کیتو؟

جواب میں پھر وہی خاموشی۔

ان دہشت گردوں نے رائفلوں کی نوکیں ان عورتوں کی چھاتیوں کے قریب کر دیں۔ عورتوں میں تب بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ مگر اس دوران ان بچوں نے اسے کھیل سمجھتے ہوئے ان رائفلوں کی نالیوں کو چھو لیا۔ بچوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے رائفلوں کی نالیوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ بچاری مائیں انہیں ایسے کھیل سے بھی باز نہ رکھ سکیں۔

سنگھو چھیتی کرو۔ حال اگے دی بڑا کم آ نے"۔ دیوار کے ساتھ آڑ لئے ایک دہشت گرد نے حکماً کہا۔"

تڑ تڑ۔ تڑ تڑ کی آوازوں میں ان دونوں عورتوں کی دردناک چیخیں کسی اور نے نہ سنیں۔ ہاں ان کی گودوں میں کھیل رہے معصوم بچوں نے اپنی ماؤں کی کربناک آوازیں ضرور پہچان لیں۔ وہ بچلائے۔ رائفلوں کی گرم نالیوں سے ان کے ہاتھ بھی جھلس گئے تھے۔ وہ اپنی مردہ ماؤں کی چھاتیوں سے چپکے رہے ساری رات گاؤں سے کسی گورو کے لال نے ان یتیموں کی خبر نہ لی۔

اگلے دن جب پولیس موقع پر پہنچی تو کوئی گاؤں والا مدعی بننے کو تیار نہ تھا۔ بھوکے اور یتیم بچوں کی مظلوم نگاہوں کو کوئی نہ پڑھ سکا۔ کاش! ان میں قوت گویائی ہوتی۔ جس بھولے پن سے وہ قاتلوں کی رائفلوں کی نالیوں سے کھیل چکے تھے اسی بھولے پن سے وہ حکومت وقت کو سچائی بیان کر دیتے۔ ٭

کیا سچ مچ میں جاسوس تھا؟

آبادی سے بہت دُور ایک گھنے جنگل کے درمیان جہاں بھول کر بھی کوئی شہری نہیں جا سکتا تھا کسی زمانہ میں انگریزی فوج کے لیے مقرر شدہ پڑاؤ تھا۔ اس جگہ ایک چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی پُرانی سرائے تھی۔ جسے بعد میں مرکزی پولیس ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ عام لوگ اُسے ابھی تک فوجی سرائے ہی کہتے تھے۔ اِس سرائے کا بیرونی دروازہ سیاہ کالے رنگ کا تھا جس پر موٹے موٹے ... ٹوپی دار کیل ہلمٹ پہنے ہوئے فرنگی فوجیوں کی یاد تازہ کر رہے تھے صدر دروازہ عام طور پر بند رہتا تھا اور اس میں لگی ہوئی کھڑکی کے راستہ آنے جانے والے آتے جاتے تھے۔ مین دروازہ پر چوبیس گھنٹے سنتری موجود رہتا تھا ۔ بڑا دروازہ تب کھولا جاتا تھا جب کوئی شاف کار اندر داخل ہوتی ہوتی تھی۔ اس سرائے میں بیس پچیس جیل نما کمرے تھے۔ جن کے دروازے لوہے کی موٹی سلاخوں کے بنے ہوئے تھے۔ کوئی روشن دان یا دریچے نہیں تھے۔ کمروں کے اندر کچھ بوسیدہ کمبل اور مُنج کی تپڑیاں موجود تھیں۔

جوں ہی ہماری گاڑی گھنے جنگل کی طرف پہنچی مجھے آنکھیں باندھ کر پر زن دین سے باہر نکالا گیا۔ اور قریب ایک گھنٹہ کی مُسافت کے بعد اس سیاہ دروازے کی کھڑکی کے راستہ اندر داخل ہونے پر میری ہتھکڑی کھول دی گئی۔ اور دو چھاچھی قوم کے سپاہیوں نے مجھے بار بار گردن سے پکڑ کر اس زور سے جھٹکے دیئے کہ مجھے زمین و آسمان

گھومتے معلوم ہونے لگے۔ ابھی میں ہوش سنبھال بھی نہ پایا تھا کہ ایک لمبی داڑھی والے سر سے گنجے حوالدار نے مجھے زور کا طمانچہ مارتے ہوئے سارے کپڑے اتارنے کو کہا۔ میں جھجکا مگر دوسرے ہی لمحہ پٹائی کے ڈر سے میں نے تمام کپڑے اتار دیئے اور مادر زاد ننگا سر جھکائے کھڑا ہو گیا۔ اُس حوالدار نے میری تلاشی لی یہاں تک کہ میرے جسم کی ہر سلوٹ اور تہہ کو بڑی بے رحمی سے ٹٹول کر دیکھا۔ پھر مجھے اپنے کپڑے اٹھانے کو کہا گیا اور متذکرہ بالا دونوں چھا چھی سپاہی میرے پیچھے بھاگ پڑے وہ مجھے بھاگتے ہوئے کو تھپڑ اور مُکّے مار رہے تھے جبکہ میں شرم و حیاء کو بھول کر جان بچانے کے لئے اُن کے آگے بھگا جا رہا تھا۔ یہ دوڑ کچھ اس طریق سے کرائی گئی کہ میں خواہ مخواہ ایک کھلے دروازے والی کال کوٹھری میں دھڑام سے گر پڑا۔ میرے اندر گرتے ہی باہر سے دروازہ کو قفل لگا دیا گیا۔ اندھیرا ہو چکا تھا اس شام مجھے کھانے کو بھی کچھ نہ ملا۔ جب میں نے حلق تر کرنا چاہا تو پاس ہی پڑے ایک مٹی کے لوٹے پر نظر پڑی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مدت سے اُس لوٹے کو بھی پانی نصیب نہیں ہوا تھا۔ ایک دو بار سنتری نے نہایت کرخت لہجے میں میری موجودگی کی تسلّی کی۔ پھر خود سنتری بھی ایک چارپائی پر سو گیا۔ رات کھٹملوں سے لڑنے میں گذری۔ میں ایک پل بھی سو نہ سکا۔

صبح ہوئی۔ سرائے میں ایک پرانے پیپل کے درخت پر مختلف قسم کے پرندے چہچہانے لگے۔ پَو پھٹنے سے پہلے ہی چڑیوں نے چوں چوں کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر طوطے ہریل اور کبوتر بھی بولنے لگے۔ ایک اونچی شاخ پر ایک گورینا بھی اپنا راگ الاپنے لگی۔ یہاں تک کہ میری کوٹھڑی کے پاس سے گذرتی ایک گلہری بھی اُس پیپل کے بوڑھے درخت پر چڑھ کر پونچھ اٹھا اٹھا کر عجیب انداز میں اپنے ساتھیوں کو بلانے لگی۔ سامنے چارپائی پر سنتری ابھی تک سویا ہوا تھا۔ پرندے

آزاد تھے۔ سنتری پابند تھا اور میں قید تھا۔

دِن چڑھنے پر دو سوکھی روٹیاں دی گئیں۔ سلاخوں کے راستے دو گھونٹ پانی میرے منہ پر پھینکا گیا۔ سنتری کہہ رہا تھا کہ کھا پی کر تکڑا ہو جا۔ اب تیری ہماری باتیں ہونگی اور پھر یکدم میرے سیل کا قفل ہٹا۔ بولٹ چلایا اور چیخا چلاتا دروازہ کھل گیا۔ دو ظالم سپاہی میری طرف خونخوار درندوں کی طرح جھپٹے۔ مجھے باہر گھسیٹ لیا گیا۔ مجھے محسوس ہوا۔ جیسے میں ایک مُردہ ہوں۔ جیسے دو کُتے کھینچ رہے ہوں۔ پھر چٹاخ چٹاخ تھپڑ پڑنے لگے۔ میں مردہ سے زندہ ہو گیا۔ میرے کان سُن رہے تھے۔ وہ مجھے سور تخم زنزل اور پتہ نہیں کیا کیا کہہ رہے تھے۔

گھسیٹتے گھسیٹتے وہ مجھے ایک گہرے گڑھے کے پاس لے گئے۔ مجھے ٹانگوں سے پکڑ کر اُس گڑھے میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ گڑھے میں دو انسانی پنجر پڑے ہوئے تھے۔ چہروں اور سر پر بال نظر آتے تھے۔ مگر باقی صرف ہڈیاں ہی ہڈیاں تھیں۔ ظاہر تھا کہ وہ بھی میری طرح مظلوم تھے۔ جو ظلم کی تاب نہ لاتے ہوئے ختم ہو گئے تھے۔ اور اب انہیں محض اِس لئے اس گڑھے میں رکھا ہوا تھا۔ تاکہ ہر نیا آنے والا اپنا انجام سمجھ سکے۔ اِس دہشت ناک منظر کو دیکھ کر میرا لہو جم گیا۔ مجھے اپنی موت نظر آنے لگی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میری نعش بھی اُسی گڑھے میں پھینکی جائے گی۔ اور اس طرح اُس گڑھے میں اب تین نعشیں ہو جائیں گی۔

مجھے باہر کھینچا گیا۔ ایک نہایت بدشکل سیاہ فام دیو ہیکل افسر جس کا چہرہ چیچک کے بدنما داغوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور سفید مونچھیں رخساروں پر بکھری ہوئی تھیں۔ اُس جگہ پہنچا اُس کے حکم سے میری ٹانگیں ایک تخت پوش کے پایوں سے اِس ڈھنگ سے باندھ دی گئیں کہ ایک ٹانگ ایک پائے اور دوسری دوسرے پائے کے اُوپر سے ہوتی ہوئیں اندر کی طرف اکٹھی ایک رسّے سے جکڑ دی گیئں۔ اور رسّی کو ایک لکڑی کے ڈنڈے

سے بل دینے شروع کر دیئے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ میرا جسم جلدی ہی درمیان سے دو ٹکڑے ہو جائے گا۔ وہ کالا دیو میری حالت دیکھ کر اتنے زور سے ہنسا کہ پیپل کے اوپر بیٹھے ہوئے سبھی پرندے اُڑ گئے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا شروع ہو گیا ——————————— میری چیخ نکل گئی۔ ایک سپاہی نے جوتا اُٹھا کر میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ وہ جلّاد آفیسر نہایت گندی گالیاں اُگل رہا تھا۔ غصّے میں اُس نے میری کمر پر ایک ٹھڈا مارا۔ میں سمجھا میری جان نکل گئی ہے۔

پھر مجھے اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹوں کی ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ مجھے احساس ہُوا کہ میں مرا نہیں تھا۔ بلکہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ میرے منہ سے جوتا نکال لیا گیا تھا۔ اور میرے منہ میں ایک پانی کا لوٹا انڈیل دیا گیا۔ کچھ پانی میرے نتھنوں میں بھی پڑ گیا۔ جس سے مجھے چھینک آ گئی۔ کچھ چھینٹے اُس سپاہی پر پڑے۔ جو غصّہ سے پاگل ہو گیا۔ اُس نے وہ بھیگا ہوا جوتا اٹھا کر میرے سر پر تڑاک تڑاک مارنا شروع کر دیا۔ میرے ناک اور منہ سے خون نکل پڑا۔ میں اس حالت میں کچھ نہ بولا۔ دراصل میں بولنے کے قابل ہی نہ رہا تھا۔

"یہ بڑا سخت جان۔ پختہ کار اور عیّار جاسوس ہے۔ یہ سیدھے منہ سے بات نہیں کرے گا۔" وہ سیاہ دیو پھر گرجا۔

اتنے میں ایک پتلے پھریرے جسم والا سفید پارچات میں ملبوس خوبصورت جوان افسر آ گیا۔ اُس کی آمد پر سب کھڑے ہو گئے۔ میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی سینئر افسر ہے۔ اُس نے میری طرف بغور دیکھا۔ اور پھر اُس سیاہ دیو کو کہا کہ میرے ہاتھ منہ دھلوائے جائیں اور پینے کو پانی دیا جائے۔ اُس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ مجھے ایک نل پر لے جایا گیا اور منہ ہاتھ دھونے کو کہا گیا۔ میں نے ناک منہ صاف کئے اور تھوڑا سا پانی پی کر حلق تر کیا۔ پھر اُس جوان افسر کے اشارے پر سارے ایک طرف چلے گئے۔ اُس افسر نے بڑی ہمدردی اور نفاست سے میرے ساتھ بات چیت کی۔ کچھ سوال و

جواب مجھے یاد ہیں جو اس طرح تھے :۔

افسر۔ آپ کا کیا نام ہے ؟

مَیں ۔ جی مجھے شیر جنگ کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔

افسر۔ آپ کے والد صاحب کی کیا تعریف ہے اور ان کا شغل کیا ہے ؟

مَیں ۔ جناب میرے والد صاحب ٹھاکر بہادر چند ہیں اور پنشن یافتہ آنریری کپتان ہیں

افسر۔ آپ کی تعلیم اور پیشہ ؟

مَیں ۔ جناب مَیں بی اے تک پڑھا ہوا ہوں اور ابھی بیروزگار ہوں ۔

افسر۔ ادھر آنے کا مقصد ؟

مَیں ۔ جناب سرحد کے نزدیک شہیدوں کی سمادھیاں دیکھنے آیا تھا۔ اتفاقیہ راستہ بھول کر ادھر آگیا ہوں ۔

اس افسر نے میری باتوں کو بڑی صدقدلی سے سُنا ۔ اپنے پاس موجود ایک مثل کو الٹ پلٹ کر پڑھا ۔ ایک نظری نقشہ موقعہ کو بار بار دیکھنے کے بعد مجھ سے اس کے مطابق بات چیت کی جو مَیں نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے عرض کیا کہ واقعی میں اس راستہ سے داخل ہوا تھا ۔

میرے بیان سے شاید اس افسر کی تسلی ہوگئی تھی ۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بنا کچھ کہے اٹھ کر چلا گیا ۔ اس کے چلے جانے کے بعد پھر وہ زندہ بھوت اپنی ڈراؤنی مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا میری طرف لپکا ۔ اس کے امدادی سپاہی بھی آچکے تھے اس نے آتے ہی بڑے رعب سے پوچھا کہ میری تعلیم کتنی ہے ؟

گریجویٹ ہوں جناب ۔ مَیں نے جواب دیا ۔ تو پھر تم زمین پر کیوں بیٹھے ہو ۔ تم تو کرسی کے حقدار ہو ۔ اور اس نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا کہ میرے لئے ایک کرسی لائے ۔ مَیں نے بڑی انکساری سے کہا کہ مَیں زمین پر ہی ٹھیک ہوں مگر وہ جلاد مجھ پر برس پڑا ۔

ماں بہن کی گالیاں دیتا ہوا کہنے لگا کہ اب بڑے افسر سے دو باتیں کر کے ئیں اس کا کہا بھی نہیں ماننا چاہتا۔ اتنے میں وہ سپاہی ایک دو فٹ لمبی اور ایک انچ موٹی چھڑی لیکر واپس آگیا۔ وہ چھڑی میری طرف کرتے ہوئے اس کالے جن نے کہا کہ اسے سیدھی زمین پر کھڑی کرتے ہوئے اوپر بیٹھ جاؤں۔ ئیں اس کی بات نہ سمجھ پایا۔ دوسرے سپاہی نے جو ابھی تک خاموش کھڑا تھا میرے دونوں کان اس بے رحمی سے مسلے کہ میرے ہوش گم ہو گئے۔ پھر پتہ نہیں کب مجھے لٹا کر میری دونوں رانوں پر زور زور سے مکے مارنے شروع کر دیئے۔ ئیں تڑپتا رہا۔ میری چیخیں یقیناً اس فوجی سرائے سے باہر بھی گئی ہونگی۔ مگر وہاں میرا پرسانِ حال کون تھا۔ جب ئیں مار سے بالکل نڈھال ہو گیا تو مجھے پکڑ کر اس چھڑی پر اس طرح بٹھلایا گیا کہ میری ایڑیاں اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں بازو سیدھے کھنچے ہوئے تھے۔ اور جسم کا سارا بوجھ پاؤں کے پنجوں پر تھا۔ درد اور کمزوری سے میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ خواہ مخواہ میرے جسم کا بوجھ اُس چھڑی پر پڑنا شروع ہو گیا۔ مجھے سخت تکلیف ہو رہی تھی مگر میں بیٹھا ہوا تھا کرسی پر۔ اس لئے کہ ئیں گرجیجوئیٹ تھا۔

مجھے کرسی دے کر وہ بے فکری سے اخبار پڑھتے رہے۔ کبھی کبھار میرے ماتھے سے چھوٹتے پسینے کی دھاریں اور کانپتی ٹانگوں کو دیکھ کر وہ بڑے غضب ناک ڈھنگ سے مجھے سیدھا بیٹھنے کا حکم دے دیتے۔ مگر میں تو کمزور اور بھوکا تھا۔ پھر اس کرسی پر بیٹھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ ئیں درد کو دانتوں تلے دبائے اپنی قسمت پر روتا رہا۔ آخر مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ ئیں کرسی سے گر گیا۔ وہ تینوں بھوت مجھ پر گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑے مجھے بری طرح نوچا گیا۔ نہ چاہتا ہوا بھی ئیں رونے لگ "بڑا حرامزادے روتا ہے۔ اور وہ بھی مصطفیٰ خان بلوچ کے سامنے۔" پھٹے ڈھول کی آواز سی گرج ہوئی۔

جناب میں راستہ بھول کر بدقسمتی سے آپ کے علاقہ میں آگیا ہوں ۔ میں کسی غلط مقصد سے نہیں آیا ۔ میں نے التماس کی ۔

ابے پاجی ۔ تو راستہ کیسے بھول سکتا ہے ۔ تو تو گریجویٹ ہے ۔ ایک طمانچہ جماتے ہوئے اس سانڈ سے تھانیدار نے سوال کیا ۔

"جناب میں شہیدوں کی سمادھیوں پر عقیدت کے پھول چڑھانے آیا تھا ۔ ابھی میرا فقرہ ختم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میرے سر پر جوتوں کی بارش شروع ہو گئی ۔

سالے وہ کونسے بہادر تھے جن کی سمادھی پر تو پھول چڑھانے آیا تھا ۔ جانتے نہیں کہ ہم نے تو ان کے بت بھی قید کر رکھے تھے ۔ بڑا آیا شہیدوں کا پرستار وہ کاٹنے والے اونٹ کی طرح زہر اگلنے لگے ۔

شہیدوں کا ذکر ذہن میں آتے ہی مجھ میں جان پڑ گئی ۔ میری غیرت جاگ اٹھی اور میں نے جوش میں کہہ ہی دیا ۔ کہ وہ شہید تو ہم سب کے تھے کیونکہ انہوں نے ہندوستان کے لیے جانیں قربان کی تھیں ۔ وہ ملک کی تقسیم نہیں چاہتے تھے ۔ ابھی میں کچھ اور کہنا ہی چاہتا تھا کہ مصطفیٰ خان بلوچ پر وحشت طاری ہو گئی ۔ اس نے مجھے دبوچ لیا اور زبردستی میرے کپڑے اتار دیئے ۔ مجھے منہ کے بل گرا کر وہ خود پھر کرسی پر بیٹھ گیا ۔ اس نے ایک سپاہی کو مولا بخش لانے کو کہا ۔

سپاہی ایک چمڑے کا موٹا ٹکڑا جس کے ایک طرف لکڑی کا دستہ لگا ہوا تھا اٹھا لایا ۔ شاید یہی مولا بخش تھا ۔

بلوچ بڑے غصے میں کرسی سے اٹھا ۔ مولا بخش کو سپاہی سے پکڑا اور یہ کہتا ہوا کہ تجھے بھی ان شہیدوں کے ساتھ ملاتا ہوں ۔ مجھ پر ٹوٹ پڑا ۔ وہ مسلسل مولا بخش میری ننگی پیٹھ پر برساتا رہا ۔ میں اس کے جوتوں کے درد سے کراہتا رہا ۔ حتیٰ کہ اس تشدد کی تاب نہ لاتا ہوا ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا ۔

اور... پرندے اُڑ گئے

اندھیری رات میں سیاہ سڑک پر سرکتی بس میں سوار لوگوں کو کب معلوم تھا۔ کہ وہ بس انہیں موت کی وادی میں لے جا رہی تھی۔ تیز رفتار بس کے ہچکولے بھی سواریوں کی نیند کے نشہ کو دُور نہ کر سکے۔ بس میں سوار ساٹھ کی ساٹھ سواریاں سو رہی تھیں۔ ایک ڈرائیور ہی جاگ رہا تھا، جس کے لمبے لمبے بازو سٹیرنگ وہیل کو گھمانے میں مصروف تھے۔ ہیڈ لائیٹس کی مدہم روشنی میں بھی اس کی آنکھیں اندھیرے کو چیر رہی تھیں۔ دفعتاً اُسے اپنی گردن پر کسی ٹھنڈی چیز کے چھُونے کا احساس ہوا۔ اُس نے کمال ہوشیاری سے بس کو بریک لگائی ایک نقاب پوش نوجوان کے ننگے ریوالور کی نوک اُس کی گردن کو چھو رہی تھی۔

"گاڑی اُدھر لے چلو" اُس نقاب پوش نے حکم دیا۔ ڈرائیور نے بلا حیل و حجت گاڑی اُس طرف کر لی۔ تقریب دو فرلانگ کے فاصلہ پر پھر اُس نقاب پوش نے گاڑی رکوائی۔ اس کے بعد ان سوئی ہوئی سواریوں میں سے تین اور نوجوان اُچھل پڑے۔ انہوں نے بڑی اونچی آواز میں تحکمانہ انداز میں کہا کہ جو لوگ بھگوان کو مانتے تھے، اور جن کی عمر ۱۸ اور تیس کے درمیان تھی۔ وہ خود بخود اپنی سیٹیں چھوڑ کر باہر چلے جائیں۔ اب تک سب سواریاں جاگ چکی تھیں سب کے دلوں کی دھڑکنیں تیز تھیں۔ اور چہروں پر خوف و ہراس نمایاں تھا۔ پھر بھگوان کو ماننے والے چھ افراد گاڑی سے باہر نکلے۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ وہ بھگوان کے دشمن یا شیطان کی اولاد اُن سے ان کا قیمتی سامان چھینیں گے مگر جونہی

وہ گاڑی سے پندرہ قدم کے فاصلہ پر پہنچے، تو اُنہیں ایک قطار میں زمین پر بیٹھ جانے کا حکم ہُوا۔ وہ سارے زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر اُن نقاب پوش نے ٹارچ کی روشنی میں اُن کے چہروں کو حقارت بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر یکبارگی تین ریوالوروں سے شعلے نکلے۔ اور تین روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر گئیں۔ سروں میں کافی نزدیک سے گولیاں لگنے کی وجہ سے مرنے والوں کے منہ سے ہائے تک نہ نکلی۔ جو زندہ موجود تھے، اُن کے مُنہ سے بھی کوئی آواز نہ آئی۔ گاڑیوں میں موجود سبھی سواریاں پتھر کی بُت بن چکی تھیں۔ یہاں تک کہ دودھ پیتے بچے بھی سانس روکے بیٹھے تھے۔ ہاں ارد گرد کے درختوں پر بیٹھے پرندوں نے ایک کہرام سا مچا دیا۔ اندھیری رات میں بھی وہ اپنے گھونسلے چھوڑ کر فضا میں چکر لگانے لگے۔ ابھی پہلے فائروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی کہ پھر تین دھماکے ہوئے۔ پھر تین جانیں بے رحمی سے تلف کر دی گئیں۔ پھر کوئی چیخ و پکار نہ ہوئی۔ کوئی آہ وبکا نہ ہوئی پھر آدم کی اولاد نے کوئی شکوہ نہ کیا۔

ہاں! اس بار پھر فضا میں دہشت زدہ پرندوں نے اپنی آوازیں تیز کر دیں۔ وہ کتنی قسم کے پرندے تھے، ان میں کوّے، طوطے، کبوتر، فاختائیں، بلبلیں جنگلی چڑیاں اور چیلیں تک شامل تھیں۔ ان میں سر کھانے والے کوّے اور نغمے گانے والے بلبل بھی تھے مگر اس وقت اُن کی مخلوط زبانی کو غور سے سننے پر ایک ہی بات بنتی تھی اور وہ تھی

اینی مار پئی کرلانے
تیں کی درد نہ آیا

-÷-

تم بے غیرت ہو!

ناظرین میں خدا ہوں۔ وہ خدا جسے آج تک آپ میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ میں دراصل آپ میں سے کسی کو بھی ملنا نہیں چاہتا۔ مجھے آپ سے سخت نفرت ہے۔ اس لئے کہ آپ میرے نام پر ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر سچ مچ میرے ماننے والے ہوتے تو ایک دوسرے سے نفرت ہی کیوں کرتے؟

مگر میرا وجود بھی تو خیال ہے۔ میں خود بھی ایک خیالی ہوں جو کائنات کے ذہن میں ابھرا ہوں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ کہ میں نے کائنات کی تخلیق کی ہے۔ مجھے تو یہ خود بھی پتہ نہیں کہ یہ کائنات۔ یہ زمین۔ آسمان، سمندر، چاند، ستارے اور سورج دسیارے کب اور کیسے عالمِ وجود میں آئے۔ پھر یہ نباتات، جنگلات، چرند پرند اور انسان کب اور کیونکر معرضِ وجود میں آئے۔

آپ اپنے کو انسان کہتے ہیں۔ آدم اور حوّا کی اولاد گیا۔ آدم نے آپ ایسے بے غیرت انسانوں کو جنم دیا تھا۔ جو محض رنگ، نسل، بال و پر اور زبان کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ یقیناً ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس نے آپ جیسے حیوانوں کو کبھی بھی منہ نہیں لگایا تھا۔ یہ سب کہانیاں ہیں کہ آدم کے بیٹے آپس میں لڑ پڑے تھے۔ ایک نے دوسرے کا سر قلم کر دیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آدم کی اولاد ایسا کبھی نہیں کر سکتی۔

آدم کے بیٹوں کی آپسی لڑائی اور قتل کی کہانی بھی تو آپ لوگوں نے ہی لکھی تھی

آپ کے پاس کیا ثبوت ہے۔ کہ میں نے آدم کو پیدا کیا تھا۔ آپ میں سے کس نے یہ دیکھا تھا؟

ہاں! آپ کی عادت شیطان سے ملتی جلتی ہیں۔ آپ آدم کی تو نہیں بشیطان کی اولاد ہو سکتے ہیں۔ کیوں کہ جو افعال بد آپ کر رہے ہیں۔ وہ انسانی نہیں بلکہ شیطانی ہیں۔ بھلا سوچو تو کہ ــــ

اپنے معبود کا قتل۔ اپنے ہی متبرک مقبرے کی تسخیر۔ اپنے ہی بھائیوں کا گلا گھونٹنا یہ کب انسانی فعل ہیں آخر!

میں خدا بھی۔ لیکن خدا میں نے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے اگر دیکھا ہے تو صرف ابلیس کو اور ابلیس (شیطان) سب کا دوست ہے۔ تھوڑا یا بہت۔

میرا۔ آپ کا کوئی رشتہ نہیں۔ کوئی تعلق نہیں تم بے غیرت ہو۔

❀
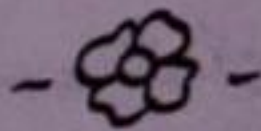
بھیانک خواب

میں نے دیکھا کہ مغرب سے مشرق کی طرف ایک آندھی اٹھی۔ اس آندھی سے پہلے بہت دیر ماحول گم سُم رہا۔ پھر اس کے بعد تھوڑی دیر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے۔ اہل دیش ان جھونکوں کی میٹھی لوریوں میں مست غفلت کی نیند سو گئے۔ پھر آندھی نے سب کو جھنجوڑ دیا۔ بڑے بڑے درخت جڑ سے اکھڑ گئے۔ فلک بوس عمارتیں گر گئیں۔ گہری نیند سوئے ہوئے لوگ گھبرائے سے اُٹھے۔ مگر اس اتھل پتھل کو قہرِ الٰہی سمجھ کر پھر پہلے کی طرح خواب غفلت میں پڑ گئے۔ ایکبار پھر فضا میں گھٹن محسوس ہوئی پھر کچھ سنسناہٹ سنائی دی۔ میں کیا دیکھتا ہوں کہ مغرب کی طرف ایک عجیب قسم ٹڈی دل اڑتا ہوا آرہا تھا۔ یہ ٹڈیاں کسی صورت میں بھی جسامت میں انسانی جسم سے کم نہیں تھیں ان کی اشکال بھی انسانوں سے ملتی تھیں فرق یہ تھا۔ کہ ان کے جسم پر جبلی بال دبیز نمایاں تھے۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ جبکہ لمبی پرواز سے تھک کر منہ کھلے ہوئے تھے اور سُرخ زبانیں باہر لپک رہی تھیں۔ اس عجیب و غریب دَل کو دیکھ کر ہر کسی پر دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ دہشت کی وجہ سے لوگ آنکھیں بند کئے بے حرکت پڑے رہے۔ جب کہ اس بالوں اور پروں والی فوج نے پکے طور پر اپنا ڈیرہ انسان کے لئے متبرک ترین مقامات میں بنا لیا۔ انہوں نے اوّل ان متبرک مقامات میں بسنے والے خدا پرست لوگوں کو قابو کیا۔ جب وہ ان پر مکمل طور پر قابو پا چکے تو انہوں نے اپنی دہشت کا دائرہ اور بھی وسیع کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ دیش کے شمالی حصّہ کو اپنا تختہ مشق بنانے میں کامیاب ہو گئے۔

کسی بھی خدا پرست انسان کو دیکھتے ہی ان پر دحشت طاری ہو جاتی۔ پھر کسی مجنوں کی طرح وہ بلا خوف اس معصوم جان پر ٹوٹ پڑتے ان کے پاس ہر قسم کے ہتھیار تھے۔ یوں کہئے کہ ان کے ناخن تیز تلوار تھیں۔ اور بات کرتے وقت منہ سے اسلحہ آتشیں کی طرح آگ اور دھواں بھی نکلتا تھا۔ ان کی خون آلود آنکھوں سے جس کسی کی بھی آنکھ ملی۔ وہی لقمۂ اجل ہوا۔

بیچارے خدا پرست لوگ ڈر اور خوف کے مارے مارے پھر رہے تھے۔ ان کی چیخ و پکار سے آسمان پھٹ رہا تھا۔ دھرتی کانپ رہی تھی۔ ہوا سسکیاں بھر رہی تھی۔ جب کہ آفتاب و مہتاب حیرت زدہ دیکھتے رہتے تھے۔

ظلم وستم کا بازار گرم رہا۔ پھر خدائے پاک تک اُن مظلوموں کی پکار پہنچی۔ انہوں نے ایک فرشتہ سیرت انسان کو ان جنات پر قابو پانے کے لئے بھیجا۔ ایک طرف خدا کے زمینی گھر پر قبضہ کئے ہوئے جنات اور دوسری طرف خدا کی مقرر کردہ روحانی فوج گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ پہاڑ سے پہاڑ ٹکرائے۔ آگ اور دھواں کے لاوے پھوٹ پڑے۔ اس لاوے میں خدا کے دنیاوی گھر پگھل گئے اور اس میں وہ شیطان فطرت جنات خود تڑپ تڑپ کر مرے۔

خُدا کا زمینی گھر۔ ناپاک رُوحوں سے پاک ہوا پھر سے مندروں سے سنکھ، مسجدوں سے اذان، گرجوں سے گھڑیال اور گوردواروں سے شبد کیرتن کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں اور ان کے شور سے میری آنکھ کھل گئی۔

یہ خواب تھا یا حقیقت؟

انسان شیطان اور بھگوان

اللہ اکبر۔ اوم ۔ ایک اونکار دھن نرنکار ۔ خدائے پاک ۔

اور اس طرح کے کتنے ہی نام ہیں جن سے خدا عالی کو یاد کیا جاتا ہے۔ ہر مشکل میں اُس کی یاد قدرتی طور پر آتی ہے۔ سُکھ میں اُسے یاد کرنے والے بہت کم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اکثر دکھی رہتے ہیں۔ دنیا میں مادیات کی پرستش کا دَور دورہ ہے دولت اور عیش و عشرت انسان کی شان و شوکت اور عظمت کے نشان ہیں۔ خدائے پاک کا نام ایک رسمی سی بات بن کر رہ گئی ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو محض دکھاوے اور مطلب کے لئے مندروں مسجدوں۔ گوردواروں اور گرجوں کے نام بھی انسان کی بڑھائی کرتے ہیں۔ برلا مندر بجلی پہلوان کا مندر۔ شاہی مسجد اور گوردواروں و گرجوں کے در و دیوار پر دان کرنے والوں کے سلوں پتھروں پر نام اس بات کا ثبوت ہیں کہ راہِ مولیٰ میں نہیں بلکہ اپنا نام اُجاگر کرنے کے لئے ہی بھگوان کے نام پر چندہ دیا گیا تھا۔

ادھر بھولے بھگوان ایک خاموش بن کر ایک سیدھے بیل کی طرح اپنے سینگ جھکائے اُن پر سونے چاندی کے پتر ے چڑھوا رہے ہیں۔ اپنے جسم پر نقش و نگار اور مینہ کاری کروا رہے ہیں۔ گویا وہ بھگوان نہیں۔ سچ مچ بیل ہیں۔ ادھر دولت اور اقتدار کے نشہ میں اندھا انسان خدا پاک کی اصل ہستی بھول کر مال و زر کو ہی اصل خُدا سمجھ بیٹھا ہے۔ اسکی عقل اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ بھلا سونے چاندی کے پتر۔ سنگ مرمر کی اینٹوں اور ہیرے جواہرات کو پاک کیا سچ مچ

بھگوان خوش ہو جائے گا اس لئے بھگوان اور انسان دونوں اس وقت بدھو بن چکے ہیں۔ اور دنیا میں شیطان اور اُس کے چیلے چپٹوں کا طوطی بول رہا ہے۔

- سر بازار ڈاکے
- کھلے عام چوری
- سینہ زوری
- قتل و غارت
- عصمت دری۔ دروغ گوئی
- دھوکہ فریب
- تنگ دلی
- فرقہ پرستی
- خویش پروری

یہ سب کچھ تو اسی لئے ہو رہا ہے۔ مگر بھگوان خاموش ہیں۔ اللہ کی آنکھ لگی ہوئی ہے۔ واہگورو۔ پرمیشور کوئی بھی فوراً آواز نہیں دے رہا۔

دُکھی دل سے فریاد کرتے تھے۔

ھے بھگوان

مگر یہ ظلم و ستم، جبر و استبداد۔ جور و ستم اور غیر انسانی افعال دیکھ کر بے ساختہ مُنہ سے نکلتا ہے۔

ہے شیطان

بھگوان کو کس نے دیکھا ہے شیطان سب کے سامنے ہے کیا بھگوان ہی شیطان ہے یا شیطان ہی بھگوان ہے؟

غرور کا سر نیچا

وہ ہر اُس شخص کو تختۂ زمین پر گھومتا پھرتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اُس کے مذہبی نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ کہ وہ خُدا کی وحدت پر یقین رکھتا تھا اور بت پرستی کو کُفر مانتا تھا۔ وہ خود بھی بہت حد تک اگر بُت پرست نہیں۔ تو تصویر پرست ضرور تھا جہاں تک خُدا کی ہستی کا تعلق ہے۔ وہ خود کو خدا کے بہت قریب سمجھنے لگ گیا تھا۔ اُس کا یہ وہم یقین کی حد بھی پار کر چکا۔ اس لئے وہ جو کچھ کہتا تھا۔ اُسے خدائی حکم سمجھ کر کہتا تھا۔

اس طرح اُس کے حکم سے ہزاروں بے قصور اور معصوم لوگ قتل ہوئے۔ سینکڑوں سہاگوں نے اپنی مانگوں سے سیندور دھو دیا۔ انگنت بچے بچیاں یتیم ہو کر بے یار و مددگار در در کی ٹھوکریں کھانے لگے۔

کتنے گھروں کے روزی کمانے والے اپنے گھر والوں کو فاقوں مرنے کے لئے چھوڑ کر راہی ملکِ عدم ہوئے۔

ہر طرف آہ وزاری بے بسی اور بے کسی کا عالم تھا اسی ماحول میں اُس خود ساختہ سلطان کے چیلے چانٹے لُوٹ مار کے مال سے گل چھرے اڑاتے رہے۔ انہیں نہ سرکار کا ڈر تھا نہ خدا کا خوف۔

اسلحہ گولی سکہ اور بارُود کے انباروں کو اپنے اِرد گرد اکٹھا دیکھ کر وہ موت کو بھول چکا چکا تھا۔ شائد وہ بھی راجہ راون کی طرح کال اپنی چارپائی کے پائے سے باندھے

بیٹھا تھا۔ آخر یہ اسلحہ اور گولی بارود کال ہی تو تھے۔

پھر اُس کے مظالم کی حد ہو گئی۔ دھرتی اُس کے بوجھ سے کانپنے لگی۔ وہ اپنے قلعہ کو ناقابلِ تسخیر سمجھ کر دھرتی کے کانپنے پر کھلکھلا کر ہنستا۔ اُس کے غضبناک قہقہوں سے قلعہ کی عمارت لرز اُٹھتی۔ اُسے اپنی طاقت پر بہت ناز تھا۔ بلکہ غرور تھا

غرور کا سر نیچا

پھر خُدا نے ایک نیک بندے کو بے شمار مظلوموں کو اس ظالم کے چنگل سے چھڑانے کے لئے بھیجا۔ وہ نیک بندہ کوئی ربّی پیغمبر نہیں تھا۔ کوئی اوتار نہیں تھا۔ اور نہ ہی کوئی سادھو فقیر۔ وہ ایک سچا انسان اور خُدا سے ڈرنے والا سپاہی تھا۔ اُس سپاہی نے اس بہروپئے جرنیل کو للکارا۔

ایک بار پھر ایک زوردار قہقہہ بلند ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی آتشیں ہتھیاروں کے منہ کھُل گئے۔ حق اور باطل کی جم کر لڑائی ہوئی۔ آخر غرور کا سر نیچا ہوا۔ اور حق کی فتح ہوئی۔ خُدائی سپاہی فتح کا پرچم لہراتا ہوا خدا کے حضور میں سرنگوں ہوا جبکہ غرور و تکبّر کا پُتلا مٹی چاٹتا ہوا دوزخ نشیں ہوا۔

کوکِلا

کوکلا محلّہ کی سبھی عورتوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ چاہے پارو سنارن طلائی زیور سے بھی زیادہ چمکتی دمکتی تھی مگر وہ بھی اُس کے سامنے ماند پڑ جاتی تھی۔ دراصل کوکلا ایک ہیرہ تھی۔ بھلا ایک طلائی زیور کا بیش قیمت ہیرے سے کیا مقابلہ ہو سکتا تھا۔ وہ دوسروں کے مستعملہ پارچات پہن کر بھی اُن کے حسن و جمال اور بناؤ سنگار کو پھیکا ڈال دیتی تھی۔ قدرت کی طرف سے حسنِ بے مثال کا عطیہ پا کر بھی کوکلا کو لوگوں سے نفرت اور حقارت ہی ملتے تھے۔ صرف اس لئے کہ وہ گلی کی خاکروبہ تھی۔ وہ نہایت محنتی تھی۔ گلی محلّے کو دھوتی سنوارتی تھی اور دوسروں کے گھر صاف کر کے اپنا گذارہ کرتی تھی۔ پیٹ بھرتی تھی۔

وہ گھر صاف کرنے کو گھر کمانا بتلاتی تھی۔ مگر جنہیں وہ صاف ستھرا رکھتی تھی جن کی گندگی اُٹھاتی تھی۔ وہ ہی اُسے گندی کہتے تھے۔ سب سے زیادہ منہ پھٹ تھی ڈاکٹر ستیہ نارائن کی بیوی دروپدی۔ وہ تو کوکلا کو دیکھتے ہی اپنے منہ کے آگے ساڑی کا پلّو لے لیتی تھی۔ کوکلا بھی دروپدی کو دیکھ کر اپنا چہرہ چڑچڑا بنا لیتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنے پیتل کے لونگ والے تیکھے ناک کو چڑھا کر دروپدی کو چڑاتی۔ دروپدی کھٹ سے اپنا کواڑ بند کر لیتی اور کوکلا بڑبڑاتی ہوئی آگے چلی جاتی۔ دوسرے نمبر پر تھی بسنتی براہمنی جو اب بھی کوکلا کے سائے سے ڈرتی تھی۔ اگر کبھی بھولے سے وہ پاس سے گذر جاتی تو بسنتی جب تک نہا نہ لیتی اپنے آپ کو بھرشٹ

(ناپاک) سمجھتی رہتی ۔ اِسی طرح دوسری عورتیں بھی اُس سے دُور بھاگتی تھیں۔

کوکِلا بڑی مستقل مزاج تھی۔ غیور تھی۔ اُس نے کبھی کسی کی پرواہ نہ کی۔ اس کی دو وجوہ تھیں۔ ایک تو گاندھی یُگ کی بیداری، دوسرے اُن گھروں کے مردوں کا اُس کے تایئں نیک سلوک۔ کوئی مرد بھی کوکلا کو دیکھ کر نفرت کا اظہار نہیں کرتا تھا ناک نہیں سکوڑتا تھا۔ اور اس کی وجہ تھی کوکلا کا حسین چہرہ۔ شاید اس جہان میں حسن کی کوئی ذات پات نہیں ہوتی۔ کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

کوکلا کے دل میں ہمیشہ ایک اُبال اُٹھتا رہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے جس سے ان منہ پھٹ عورتوں کا منہ توڑ سکے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی کہ وہ اُسے صرف گندگی اُٹھانے پر ہی نیچ اور اچھوت جانتی مانتی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو اِس لئے اونچی سمجھتی تھیں کیونکہ ان کی پیدائش اونچے گھرانوں میں ہوئی تھی اور وہ امیر گھرانوں میں شادی شدہ تھیں۔ وہ کسی صورت بھی اُن سے کم نہ تھی۔ کوکلا کسی ایسے پیشے کو اختیار کرنے کے انتظار میں تھی جس سے وہ ان نخریلی عورتوں کے ڈھیلے اجسام کو کھینچ مروڑ سکے اور اُنہیں ثابت کر سکے کہ جس جسم سے وہ نفرت کرتی تھیں وہ بھی ایک سماج کا ایک ضروری انگ ہے۔

بڑی تگ و دو کے بعد کوکلا نے محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کی طرف سے چلائے گئے ایک ٹریننگ کورس میں داخلہ لے لیا اور دائی کا کام سیکھ لیا۔ اُسے جلد ہی سرکاری ملازمت مل گئی۔ اُس کی میٹھی زبان اور صاف ستھرے رہن سہن کو دیکھ کر حکام نے اُسے شہر میں ہی تعینات کر دیا۔ اب کوکلا ہمیشہ صاف ستھرے لباس میں نظر آتی جس سے اُس کی خوبصورتی اور بھی نکھر آئی شیریں زبان تو تھی ہی ساتھ ہی خود دار ہونے سے شہر میں اُس نے اچھی شہرت حاصل کی اپنے کام میں وہ خاصی دلچسپی رکھتی تھی۔ اب وہ اُس محلہ میں جس کی گندگی سر پر اُٹھاتی رہی تھی دسویں

پندرہویں دن چکر لگاتی ۔ وہ ہر فرقہ کی عورتوں کے ڈھیلے ڈھلکے بدنوں کی مالش کرتی اور رگ پٹھے کھینچتی ۔ نوزائدہ بچوں کا استقبال کرتی اور اُمیدوار عورتوں کو ڈھارس بندھاتی، اُن کے بچوں کی پیدائش میں مناسب امداد کرتی ۔ نئے آنے والوں کو نہلاتی اور اپنے ہاتھوں سے اُن کے منہ شہد لگاتی۔ اُس نے باری باری درو پدی بسنتی۔ پارو اور دوسری اونچی ذاتوں کی عورتوں کے بچوں کو خوش آمدید کہا اور اپنے پاک ہاتھوں سے اُن کے منہ کو آب حیات لگایا۔ اِس طرح کو کلا نے اپنی محنت سے اپنا جیون سنوار لیا اور اپنا دھرم اونچا کر لیا

بدتمیز

سنیل دبے پاؤں گھر میں داخل ہو گیا گھر پر رتو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا سنیل کو اندر آتے دیکھ کر وہ ڈرائنگ روم میں سجے صوفے پر نیم دراز ہو گئی سنیل نے اِدھر اُدھر دیکھ کر یہ تسلی کر کے کہ اس وقت تو گھر پر اکیلی تھی۔ ڈرائنگ روم کا رُخ کیا۔ پھر اُس نے اپنی پینٹ میں چھپائے ہوئے انگریزی اخبار کو نکالتے ہوئے رتو سے پوچھا کہ اس کا رول نمبر کیا تھا۔

رول نمبر تو مجھے یاد نہیں رہا۔ لایئے اخبار شاید دیکھتے دیکھتے یاد آ جائے رول نمبر بھی بھلا بھولنے کی بات ہے کسی ڈائری میں نوٹ کیا ہو گا اٹھ کر دیکھیں سنیل نے ہدایت کی۔

رتو بادل نخواستہ صوفے سے اٹھی اور ڈرائنگ روم میں پڑی اپنی ہی ایک فوٹو کی پشت سے پڑھ کر کہا تو فور تھری ون یعنی چوبیس ہزار تین سو اکیس۔"

سنیل نے یکبارگی اپنی نظریں اخبار پر فوجیوں کی طرح ترتیب دار کھڑے رول نمبروں پر دوڑائیں پھر اس نے اخبار رتو کے حوالے کر دیا۔

کیوں کیا بات ہے۔ کچھ بتلایا نہیں۔" یہ کہتے ہوئے رتو نے خود اپنا رول نمبر تلاش کرنا چاہا مگر شاید وہ غائب تھا۔ اخبار اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا اور وہ اوندھے منہ صوفے پر گر پڑی اس کا بھرا بھرا پُلپلا سا جسم سسکیوں سے ہلنے لگا سنیل کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اسے کیسے تسلی دے ایک دو بار اس کے نزدیک گیا مگر نہ اس

کے ہاتھ آگے بڑھے اور نہ ہی اس کے منہ سے کوئی لفظ نکلا۔

کافی دیر تک رتو صوفے پر پڑی سسکیاں بھرتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے آنسوؤں سے صوفے کا کپڑا بھیگ گیا۔ سنیل سے یہ سب کچھ نہ دیکھا گیا۔ وہ اس کے برابر قالین پر بیٹھ گیا۔ اور اسے ڈھارس بندھانے لگا کہ اس ناکامیابی میں بھی ضرور بہتری ہوگی کیونکہ ہوسکتا ہے اس بار اس کے نمبر کم ہوں اور کلاس بھی اچھی نہ ہو اس سے اسے ہمت کر کے پھر سے محنت کرنا ہوگی تاکہ آئندہ امتحان میں بہتر کارکردگی کا ثبوت دے سکے۔ سنیل اپنے آپ بولتا رہا اسے سمجھاتا رہا۔ ڈھارس بندھاتا رہا مگر رتو بدستور سسکیاں بھرتی رہی آخر سنیل نے رتو کے نرم بالوں میں اپنی کانپتی انگلیوں سے کنگھی سی کرنی شروع کردی۔ رتو بھی اسی طرح اوندھے منہ پڑی رہی سنیل کی کانپتی انگلیاں پہلے پیشانی اور پھر پرنم آنکھوں پر گئیں اس نے ان آنسوؤں کی باڑھ کو انگلیوں کے پوروں سے روکنا چاہا مگر اس کے ہاتھوں کے لمس سے تو جیسے باندھ ہی ٹوٹ گیا ہو۔ آنسو اور بھی امڑ امڑ کر نکلنے لگے جن سے نہ صرف سنیل کے ہاتھ بلکہ رتو کے گورے گورے گال بھی تر ہو گئے پگھلے سیسے سے آنسو مسلسل بہے جا رہے تھے سنیل کا دل بھی ہمدردی اور محبت کی گرمی سے پگھل چکا تھا اسے کوئی سبیل نہیں سوجھ رہی تھی جس سے دل شکستہ رتو کو دل رکھنے کو کہے گھر میں تنہائی کا عالم ہمدردی اور محبت کے جذبات کا اس کے دل میں جوار بھاٹا سا آیا پھر پتہ نہیں کب سنیل نے رتو کے بھیگے چہرے کو سیدھا کیا۔ اپنی کانپتی انگلیوں کے پوروں سے ان موندھی آنکھوں کو پونچھا گیلے گیلے گالوں پر پوروں کو گھمایا اسے ایسا محسوس ہوا کہ رتو اسکی ہمدردی کو قبول کر رہی تھی آنسوؤں سے تر گلابی ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ سنیل نے انجانے جذبے کے تحت جھک کر رتو کے رسیلے ہونٹوں کو چوم لیا اس کے منہ کا مزا سلونا ہو گیا۔ ابھی مشکل سے اس نے اپنے لب ان نیم وا ہونٹوں سے اٹھائے ہی تھے کہ رتو بول اٹھی

"بدتمیز"

تو پھر اوندھے منہ پڑی تھی جبکہ سینی ہمدردی جتاتا ہوا اس کے سلونے آنسوؤں کا مزا چکھ کر واپس چلا گیا۔ ردّی نمبر سے بھرا اخبار پنکھے کی ہوا سے چرمراتا ہوا رتو کا منہ چڑا رہا تھا۔

کُتّے بھونکتے رہے

دیہی آبادی سے دُور ایک مسمار شُدہ گاؤں کی راکھ مٹی کے تودے پر دھرتی کا سینہ چیر کر اور ریت مٹی چھان کر اُس غریب کنبے نے اپنا مستقل مستقر بنایا تھا۔ صدیوں پہلے اُس جگہ غیر ملکی حملہ آوروں نے ایک بستے رستے گاؤں کو جلا کر خاکستر کر دیا تھا اور مردوں عورتوں اور بچوں کو زندہ ہی اُس آگ میں جھونک کر اپنے معبود کو خوش کیا تھا۔ اللہ یا اُس کا مقرر کردہ معبود تو اس ظلم کو دیکھ کر کبھی خوش نہ ہوئے مگر اُن سفاک قاتلوں نے اپنی جھولیاں مال و دولت سے ضرور بھر لیں اور خوشی کا اظہار کرنے کے لئے جی بھر کے نوشی کی تھی اور ناچا گایا تھا۔ وہ واقعی بربریت کا ننگا ناچ تھا۔ مرنے والے مر گئے اور مارنے والے بھی مر گئے مگر سیاہ اور سُرخ رنگ کی جلی ہوئی مٹی صدیوں زندہ رہی۔ اُسی مٹی پر پھر اُن بت پرستوں نے بستی بسائی تھی۔ وہ تو ذرّے ذرّے میں اُس کا نُور دیکھتے تھے۔ اُن کا یقین تھا کہ وہ اُن خیالی تخلیقات کی معرفت اپنے رب کو پا سکتے ہیں۔ اُن کے عقیدے کے لوگ بھی تو خدا رسیدہ کہلائے تھے۔

انسان اوّل سے ہی اپنی نسل کا بیری رہا ہے۔ ہندو مُسلمان بودھ یہودی اور اونچی سب میں ظالم لوگ ہوئے ہیں۔ وہ جب دوسروں پر ظلم کرتے تھے تو انہیں کیا حاصل ہوتا تھا۔ سبھی اپنی انا کو خوش کرنے کے لئے حکم دیتا تھا؟ جس طرح ایک عقلمند انسان کی عقل میں خلل آ جاتا ہے میں اُسی طرح انسانوں کو مجموعی طور

پر یہ ذہنی بیماری لاحق ہو جاتی ہے۔ جس سے وہ اپنی ہی نسل کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ دُنیا سے نہ ہندو ختم ہوئے ہیں نہ مسلمان نہ عیسائیوں کی آبادی میں کمی آئی ہے اور نہ ہی یہودی تختہ زمین سے اُڑ گئے ہیں۔ جب تک اللہ کا نام باقی ہے اُس کے نام لیوا بھی زندہ رہیں گے۔

ہاں تو بات تھی سُرخ سیاہ مٹی کے تودے پر بسنے والے بُت پرستوں کی اس باران پر کسی غیر مذہب والے نے ظلم نہ کیا بلکہ وہ اپنے ہی بدلے ہوئے روپ کے ہاتھوں گولیوں کا نشانہ بنیں۔ اُن کا گناہ صرف یہ تھا کہ وہ پرانے طور طریقوں پر خُدا کو پانے میں مصروف تھے۔ انہیں اپنے مذہب اور عقیدے میں تجدید گوارہ نہ تھی۔ وہ جس دھرم میں پیدا ہوئے تھے اسی میں ہی مرنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنے مذہب عقیدے پر فخر تھا۔

بُرا ہو اُس خود غرض سیاستدان کا جس نے سستی شہرت اور دولت سمیٹنے کے لئے ان بُت پرستوں کو اپنے خُدا اور قوم کے دشمن قرار دیا۔ جاہل اور تنگ نظر لوگوں نے اس کی راہ اپنائی اور ہتھیار اٹھا کے ان بھولے بھالے لوگوں کو تنگ کرنا اور قتل کرنا شروع کر دیا۔ سیاست کے پردے میں یہ انسان دشمن گروہ جنگلی سانپوں کی طرح پلتے رہے۔ انہوں نے گھس پیٹھ اور گھات لگا کر مارنے کے طریقوں سے ان امن پسند شہریوں کو ڈسنا شروع کر دیا۔ اَن گنت لوگوں کو بنا کسی گناہ کے گولیوں سے بھون ڈالا گیا بیواؤں اور یتیموں کی آہ و پکار سے صُوبہ ایک ماتم کدہ کی شکل اختیار کر گیا۔ اُس تودے کے باسی بھی ایسے ہی غاصبوں کے ہاتھوں بے رحمی سے قتل ہوئے۔ ان کا دردناک انجام اس طرح ہوا تھا۔

ستمبر کی وہ رات بہت اندھیری تھی۔ بدلتے موسم کی میٹھی میٹھی ہوا نے اُس بستی کے لوگوں کو گہری نیند سلا دیا تھا۔ وہ محنت کش دنیا و مافیہا سے بے خبر

دن بھر کی تکان سے چُور محوِ خواب تھے۔ اسی اثنا میں کچھ ہتھیار بند ظالموں کا ٹولہ آیا۔ اُن کے سردار نے بستی کے ایک معمر مزدور کو جو کھلی جگہ سو رہا تھا بیدار کیا اور کہا کہ سرکاری حکم سنانے اور ان کی حفاظت کا انتظام کرنے کے لئے وہ آئے تھے۔ بستی کے سب لوگوں کو اکٹھے کرے تاکہ انکی بود و باش کا خاطر خواہ انتظام ہو سکے۔ لوگ آئے جن میں بچّے، جوان اور بوڑھے سبھی شامل تھے۔ پھر بستی کے چودھری نے اپنے گھر سے ان مبینہ سرکاری ملازمین کے لئے چائے منگوائی۔ چائے کی چسکیاں بھرتے ہوئے ان ہتھیار بند شیطانوں نے اکٹھے ہوئے لوگوں کو ایسے دیکھا جیسے کوئی جنگلی بلاّ مرغیوں کے غول کو دیکھتا ہے۔ بستی کے لوگ اپنے مبینہ محافظوں کو دیکھ کر یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب انہیں کسی چور اچکے کا ڈر نہیں رہے گا۔ چائے ختم کرنے کے بعد خالی پیالیاں ایک جگہ رکھ دی گئیں۔ پھر سردار کے اشارہ پر اُن وحشیوں نے اپنے رائفلوں کے منہ دھرتی کے لالوں کی طرف کر دیئے۔ کس کو گمان تھا کہ ان سے مانگ کر چائے پینے والے اُن کا ہی خون بہائیں گے۔ پھر دن دنا دن کی آوازوں سے رائفلوں سے شعلے نکلے اور صدیوں سے اجڑی سیاہ سرخ دھرتی کو بسانے والے لوگ پلک جھپکتے ہی ابدی نیند سو گئے۔ گولیوں کی آواز سے ڈر کر پالتو کتے کچے کوٹھوں کی چھتوں پر چڑھ کر بھونکنے لگے ہتھیار بند سورمے اپنا کام پورا کر کے فاتحانہ انداز میں گولیاں چلاتے پھر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ بستی کے قریب دو درجن افراد اپنی جانیں گنوا کر اب گولیوں کی آواز سے بے خبر نہ کھلنے والی نیند سوئے ہوئے تھے۔ ان کے پالتو کتے بھونکتے رہے۔ مگر ان کی آواز کسی کے کانوں میں نہ پڑی۔ اگلی صبح پولیس، پریس اور پانی میں آگ لگانے والے آئے اور چلے گئے۔ مجرمان کا کچھ پتہ نہ چلا، کتے بھونکتے رہے۔

خوبصورت دل

گول مٹول روئی دار چہرے پر چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں، چپٹی ناک موٹے موٹے بھدے ہونٹ اور بے ترتیب دانتوں والی دوشیزہ اُس کی نظر میں بہت خوبصورت تھی۔ کالج کی دوسری حسینائیں تو کسی صورت بھی اُس کے پاسنگ نہیں تھیں۔ صرف اس لئے ہی نہیں کہ وہ نیک چلن اور پڑھنے لکھنے میں ہوشیار تھی بلکہ اس لئے کہ وہ ایک پاک اور خوبصورت دل کی مالکن، عصمت اور عفت کی دیوی اور حیا کی ملکہ تھی۔

سیول لائنز امرتسر میں واقع سُروپ رانی گورنمنٹ کالج فار ومن میں ایم اے فرسٹ ایئر کی وہ طالبہ کسی امیر گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ ایک ریلوے گیٹ مین کی اکلوتی بیٹی تھی جو اپنی محنت کے بل بوتے جماعت چہارم سے بی اے تک وظیفہ حاصل کرتی ہوئی پوسٹ گریجویٹ کورس تک پہنچ گئی تھی۔ اُس نے اِس طالب علمی کے زمانہ میں صرف کھدّر کے کپڑے ہی پہنے تھے۔ اس سے بڑھ کر وہ اور کچھ پہن بھی نہیں سکتی تھی۔ ایک ریلوے پھاٹک کا رکھوالا اُسے اور کیا مہیا کر سکتا تھا۔ شکر تھا کہ خُدا نے انہیں دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو روٹی دی تھی۔ سادہ دال روٹی کھا کر بھی اُس کے چہرے پر سُرخی موجود تھی۔ اِس میں اس کی مشقت اور نیک چلنی کا زیادہ دخل تھا۔

امریک خالصہ کالج امرتسر کا گنا چُنا جوان تھا جو کھیلوں کا شہزادہ کہلاتا تھا ایک دن جب وہ اسکوٹر پر سوار بند پھاٹک کے نیچے سے گذرنے لگا تو اُس کا

پاؤں ریل کی پٹڑی سے ٹکرا گیا وہ خود تو گرا ہی اُس کا سکوٹر بھی وہیں لڑھک گیا
اُدھر ٹرین کی وسل زہریلے سانپ کی پھنکار کی طرح کانوں میں پڑی اور سیاہ فام
انجن جیسے امریک کو کچلنے کے لئے نزدیک آنے لگا۔ اُس وقت اگر سونیا
اُسے کھینچ کر ایک طرف نہ کرتی اور وہ دونوں مل کر سکوٹر کو ریلوے ٹریک سے
باہر نہ کھینچتے تو امریک اور سکوٹر دونوں ہی کچلے جاتے غصے میں وسل کرتا اور
دھواں چھوڑتا انجن گاڑی کو کھینچتا آگے نکل گیا۔ سونیا نے امریک کو پانی کا گلاس
پیش کرتے ہوئے پوچھا کہ جلدی میں اُسے کوئی خراش تو نہیں آئی تھی۔

"نہیں تو۔ بہت بہت شکریہ" امریک نے بڑے نرم لہجہ میں جواب دیا۔
شکریہ کس بات کا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔ پھر باپو کی نوکری کا سوال بھی تھا۔ سونیا بولی
نہیں نہیں قصور میرا ہی تھا۔ جب پھاٹک بند تھا تو مجھے لائن پر آنا ہی نہیں چاہیئے
تھا۔ یہ کہتا ہوا امریک سکوٹر اسٹارٹ کر کے چلا گیا۔ دیکھنے والے سونیا کی دلیری
پر حیران و ششدر رہ گئے۔ پھر جب کبھی امریک اسلام آباد ریلوے پھاٹک
سے گزرتا تو سونیا کے باپو کو ضرور مل کر جاتا۔ اُس نے بے شک سونیا کے
بارے کبھی بھی نہ پوچھا۔ البتہ دل ہی دل میں وہ سونیا کو دل دے چکا تھا۔ اُسے
ابھی تک یہ پتہ نہیں تھا کہ وہ ایک نہایت ذہین اور محنتی طالبہ تھی۔

دو سال کے عرصہ میں دونوں نے اپنے اپنے امتحانات پاس کر لیئے
امریک نے کھیلوں میں بھی اچھا نام کمایا جبکہ سونیا فرسٹ کلاس میں ایم اے
اقتصادیات کر گئی۔ اب وہ دن بھی آگیا جب سروپ رانی کالج میں کانووکیشن کا
انعقاد ہوا جس میں ہز ایکسی لینسی دی گورنر پنجاب نے ڈگریاں بانٹی تھیں۔ کالج
کے پرنسپل کی فرمائش پر خالصہ کالج بھنگڑہ ٹیم بھی منگوائی گئی۔ مہمانوں کی تفریح
طبع کے لئے کالج کی گدھا ٹیم بھی تیار تھی۔ تقسیم اسناد سے پہلے بھنگڑا اور گدھا

کے ناچ ہوئے۔ اگر بھنگڑے میں امریک کا رول نمایاں تھا تو گدے میں سونیا پیش پیش تھی۔ دیکھنے والوں نے دونوں کی دل کھول کر تعریف کی۔

امریک تو اُسی روز سے سونیا کے پیار میں بندھ چکا تھا جب اُس کی نازک انگلیوں نے اسے ریل کی پٹری سے سہارا دے کر اُٹھایا اور موت کے منہ سے بچایا تھا اب جب اُسے یہ پتہ چلا کہ سونیا ایم اے میں امتیازی پوزیشن لیکر کامیاب ہوئی ہے تو سونے پر سہاگے والی بات ہوئی۔ وہ اُس سے ازدواجی زندگی میں بندھنے کے لئے بے قرار رہنے لگا۔ اس کے لئے اُس نے کوشش بھی شروع کر دی۔ اُدھر سونیا نے سوچا کہ اب دو سال لیکچرار بن کر اپنے بوڑھے والدین کی خدمت کرے تا کہ انہیں بھی سکھ کا سانس ملے۔ پھر اُسے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ اُس بھونڈے چہرے والی غریب لڑکی سے کوئی نوجوان شادی کرنا پسند کریگا۔ امریک تو ایک امیر گھر کا لڑکا تھا۔ اُس کے بارے ایسا سوچنا بعید العقل تھا۔

اسلام آباد ریلوے پھاٹک پر ایک اور المیہ ہو گذرا جس نے سونیا کے سارے خواب مٹی میں ملا دیئے۔ ہوا اس طرح کہ ایک شام ایک شرابی ٹرک ڈرائیور نے تیز رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے سونیا اور اُس کے باپ کو کچل کر رکھ دیا۔ بیچارہ بوڑھا تو موقعہ پر ہی دم توڑ گیا جبکہ سونیا کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی۔ اُسے نازک حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ وہاں وہ تین روز بیہوش پڑی رہی ڈاکٹروں کی رائے میں اُسے ذہنی صدمہ بھی پہنچا تھا۔ جب چوتھے دن اُس نے آنکھیں کھولیں تو امریک کو اپنے پاس موجود پایا۔ امریک سے نظریں چار ہوتے ہی اُس کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا۔ اور آنسو اُمڈ اُمڈ کر نکلنے لگے۔ امریک نے اُس کی ڈھارس بندھائی اور ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا۔

سونیا کو اپنے سپنوں کا محل گرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ اب اُس

لنگڑی کو کون اپنائے گا۔ اب وہ صرف بدصورت ہی نہیں بلکہ اپاہج بھی تھی۔ مگر قدرت کے رنگ نرالے ہیں۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے دوسرے دن ہی امریک نے اُس سے شادی رچانے کی بات کی۔

'شادی اور وہ بھی مجھ ایسی بدصورت سے امریک مجھ سے یہ مذاق اچھا نہیں۔" سونیا مجھے خوبصورت جسم کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو خوبصورت دل کی تلاش ہے جو آپ کے پاس ہے۔ چلو میرے ساتھ ہم کورٹ میرج کریں گے" امریک نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پھر دو خوبصورت دِل ہمیشہ کے لئے ایک ہو گئے۔

چڑی چونچ بھر لے گئی

اندھیر نگری چوپٹ راجہ ۔ ٹکے سیر بھاجی ٹکے سیر کھاجا ۔ نہ جانے یہ محاورہ کب گھڑا گیا تھا۔ مگر اس کا اطلاق موجودہ دور میں خوب ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اندھا گائے بہرہ بجائے۔ یا پھر اندھے کو اندھا راستہ کیوں کر بتائے۔ محاورے بھی اسی دور پر راست آتے ہیں ۔ روز ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات میں اعلانات سننے پڑھے جاتے ہیں۔ کہ حکومت کرپشن کو جڑ سے اکھاڑنے کا تہیہ کئے بیٹھی ہے جڑ تو بہت گہری ہے شائد وہاں تک روس اور امریکہ کے تیل تلاش کرنے والے بھی نہ پہنچ سکیں ۔ البتہ اس درخت کی شاخیں تو ہر چشم بینا کو نظر آتی ہیں۔ اگر آپ جنم سے اندھے ہیں مگر عقل کے اندھے نہیں تو یقیناً آپ بھی اس بدعت کا احساس کر سکیں گے ۔ چلئے ہم اس بات کے ثبوت میں کچھ حقائق بیان کرتے ہیں۔ مشتے نمونہ از خروار ہے۔

کیا تھانوں کچہریوں میں رشوت نہیں چلتی ؟ کیا محکمہ ریلوے میں سیٹ بُک کرانے کے لئے بابو کی مٹھی گرم نہیں کرنی پڑتی ؟ کیا ہندوستان سے پاکستان اور پاکستان سے ہندوستان آنے جانے والے مسافروں سے وصولی نہیں کی جاتی ؟ کیا کسٹمز۔ مال جنگلات ۔ اور انہار کے محکمہ جات میں بنا پیسے سے کوئی کام سرے چڑھتا ہے ؟ کیا اسمبلی اور پارلیمنٹ کی ٹکٹیں تقسیم کرتے وقت ہاتھ نہیں رنگے جاتے ؟ اس طرح تو یہ سلسلہ ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ بیچارے ذلیل ہو کر رشوت لینے والوں

ے بھی ان کی ذلالت چھپانے کے لئے رشوت لی جاتی ہے۔ مگر آج کل ہم آپ کو ایک ایسے سرکاری عہدہ سے متعارف کرا رہے ہیں جو کسی مانی ہوئی کلاس۔ ہماری مراد ون ٹو یا تھری میں نہیں آتا۔ مگر وہ عہدے دار روپیہ بٹورنے میں بڑوں بڑوں کو مات دے گیا ہے۔

آپ نے لفظ رنر تو سنا ہوگا۔ انگریزی لغات کے مطابق رنر دوڑنے والے یا پھر قاصد کو کہتے ہیں۔ مگر یہاں ہم سیدھے الفاظ میں محکمہ خوراک کے چوکیدار نما رنر کا ذکر کرنے لگے ہیں۔

ہمارے ہمسائے چودھری بشن داس ہیں جو ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ریٹائر ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم بھی خاصی پڑھی لکھی ہے۔ تین لڑکے ہیں جو تینوں مختلف کالجوں میں پروفیسر ہیں۔ اچھی خاصی تنخواہیں پاتے ہیں۔ چودھری صاحب اور ان کی بیگم لڑکوں کی قابلیت اور نیک کمائی پر قانع ہیں۔ مگر ان کی قناعت کو ایک دیگر ہمسائے کی بیوی نے بری طرح دھکا لگایا۔ اس طرح کہ ایک روز ان کے ہمسائے تر لوکی ناتھ کی بیوی رینو کا ریشمی ساڑھی باندھے اور کہنیوں تک سونے کی چوڑیاں پہنے آ گئی۔ بیچاری ہیڈ ماسٹر صاحب کی بیگم اور بہو تو ٹمنڈ والے بازو لئے پھرتی تھیں رینو کا کی چوڑیوں کی جھنکار نے ان سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ رینو کا نے اتراتے ہوئے کہا کہ وہ آنٹی اور ان کی بہوؤں کو اکثر بنا چوڑیوں کے ہی دیکھتی ہے۔ کیا انہیں اپنے بازو ہلکے ہلکے نہیں لگتے۔ اتنا کہہ کر اس نے اپنی طلائی چوڑیوں سے لدی بانہوں کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ جس سے چوڑیوں میں ایک ترنم سا پیدا ہو گیا۔ بیچاری ہیڈ ماسٹرانی اور اس کی بہوئیں بھونچکی ہی رہ گئیں۔

"رینو کا آپ کے ہسبنڈ کیا کرتے ہیں؟" آنٹی نے سیدھا سوال کیا۔

"وہ محکمہ خوراک میں رنر ہیں" رینو کا نے بڑے فخریہ انداز میں جواب دیا۔

"رنبر کیا وہ کھلاڑی یا اتھلیٹ ہیں ؟" آنٹی نے بات بڑھائی۔

"نہیں تو۔ وہ تو بس رنبر یعنی مینیجر ہیں۔ اکثر ایک جگہ ہی رہتے ہیں۔ وہ دوڑتے بھاگتے بالکل نہیں ہیں۔ پھر وہ تو ہیں بھی بھاری بھرکم۔"

رینوکا لجاگئی۔

"رینوکا ان کی تنخواہ کتنی ہے ؟" آنٹی نے پوچھا۔

تنخواہ تو میں نے بھی کبھی نہیں پوچھی۔ یہی کوئی گیارہ بارہ سو ہوگی۔" کچھ جھینپتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

"بس! گیارہ بارہ سو۔ اتنے میں تو دال روٹی بھی نہیں چلتی۔" آنٹی نے منہ پھلا کر کہا۔

"یہ دال روٹی تو ہماری مفت ہی ہو جاتی ہے۔" رینوکا چہکی۔

آپ کا پتی کونسا فوج یا نیم فوجی محکمہ ہے۔ بھلا آپ کی دال روٹی کیسے مفت ہوتی ہے ؟" آنٹی نے کرید کر سوال کیا۔

"آنٹی دال سبزی روٹی ہی کیا ہمیں تو کپڑا اور مٹھائیاں بھی مفت ملتی ہیں۔ پھر مالک مکان کو بھی ہم نقد کچھ نہیں دیتے" رینوکا نے تیر چھوڑا۔

اب تو آنٹی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس کی بہوئیں اب تک رینوکا کی ریشمی ساڑی اور گوری گداز باہنوں پر چمچاتی طلائی چوڑیاں ہی دیکھ رہی تھیں۔ وہ تو سب ایم اے پاس تھیں۔ آخر ان میں سے ایک نے اپنی ساس کی جگہ سوال کرنے شروع کر دیئے۔

بہو۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ تم تو بڑی بھاگونتی ہو۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ یہ ماجرا کیا ہے ؟

رینوکا۔ دیدی۔ یہ سارا رنبر (مینیجر) ہونے کا کمال ہے۔ اب دیکھیں نا بھلا گیارہ بارہ سو میں کیا بنتا ہے۔ ہم تو دال سبزی چینی گھی اور کپڑا بلکہ کرایہ مکان تک نقد

نہیں ادا کرتے۔ ان سب کے لئے ہم جنس میں ادائیگی کرتے ہیں۔ یعنی گندم یا چاول دے دیتے ہیں۔ بس ہماری بچت ہی بچت ہے۔

بہو۔ پر آپ کی تو کوئی زرعی زمین نہیں۔ پھر یہ جنسیں کہاں سے آتی ہیں؟

رینوکا۔ لو جی اور سنو۔ بھلا جن کی زمین نہیں ہوتی اُن کے پاس اجناس نہیں ہوتیں۔ ہمارا تو محکمہ ہی اجناس سے متعلق ہے۔ اپنی ضرورت کے مطابق لے لیتے ہیں۔ بھلا لاکھوں بوریوں میں سے اگر دس بیس پھٹ بھی جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے پھر یہ توندی سے چونچ بھرنی والی بات ہے۔

آنٹی۔ تو کیا یہ اختیار رنز کو ہی ہے۔ یا کسی دوسرے کو بھی؟

رینوکا۔ مجھے کسی دوسرے سے کیا۔ میں تو اپنے بھاگ لیکر آئی ہوں۔ بھگوان میرے پتی کو لمبی عمر دیں۔ اور وہ رنز بنیں رہیں۔

اچھا تو اب چلتی ہوں۔ طلائی چوڑیوں کا ساز بجاتی مٹکتی ہوئی اپنے گھر چلی گئی۔

جب رات کو ہیڈ ماسٹر صاحب اور اُن کے پروفیسر بیٹے کھانے پر اکٹھے ہوئے تو گھر کی عورتوں نے مل کر سوال کیا کہ کیا اُن کے پتی پروفیسر کے بجائے رنز نہیں بن سکتے۔ مگر جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے اصلیت بیان کی تو وہ دم بخود رہ گئیں۔

دان دیئے دھن نہ گھٹے

دامودر دادا دڑے دارو کا بادشاہ تھا۔ شہر کے دل میں اُس کا ریستوران دل کی طرح ہر وقت دھڑکتا رہتا تھا۔ دن ہو یا رات اُس کے ہوٹل میں میلہ لگا رہتا تھا۔ ریستوران بھی ایک چوراستہ میں واقع تھا۔ گاڑیوں اور پیدل لوگوں کی آمدورفت کا انتظام کرنے کے لئے چوک میں ایک چاک وچوبند سپاہی کھڑا رہتا تھا۔ ریستوران کسی دیسی مہاراجہ کے محل سے کم نہ تھا۔ رہائش اور کھانے پینے کی آسائش کے علاوہ دارو پینے اور ڈرا لگانے کی سہولیات بھی میسر تھیں۔ جام و مینا سے لطف اندوز ہونے والے اور داؤ پر پیسے لگانے والے ہوا کی طرح آزادانہ طور پر وہاں آتے جاتے تھے۔ جوئے دڑے میں نال نفع کی صورت میں اتنا کچھ بچ جاتا تھا کہ ہوٹل اور ریستوران سے ہونے والی آمدن اُس کے پاسنگ بھی نہ تھی۔ اور یہ سب کچھ ہوتا تھا کھلے عام۔ اکثر بڑے بڑے عہدیدار بھی سفید پارچات میں وہاں عیش وآرام کے لئے آتے جاتے دیکھے جاتے تھے۔ دامور دادا کے حکم سے انہیں ہر سہولت مفت میں ملتی تھی۔ اور جب سیاں بھئے کوتوال اب ڈر کا ہے کا۔ یہ ریستوران یا بدمعاشی کا اڈہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔

لوگ حیران تھے کہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اراکین انتظامیہ خاموش کیوں تھے۔ کیوں دامور دادا کو اُس غیر قانونی دھندے سے باز نہیں رکھا جاتا تھا؟ جب کوئی قابل قبول جواب نہ مل پاتا تو لوگ انتظامیہ پر مل بھگت کا

کا الزام دھرتے اور موردالزام مقامی داروغہ پولیس، جس کے حلقہ میں یہ دھندہ چلتا تھا۔ داروغہ تو بہت چھوٹا افسر ہے۔ محض اس کے ملنے سے تو یہ دھندہ چل نہیں سکتا تھا۔ پھر داروغہ تو آئے دن چھاپے مارتے تھے۔ یورش کرتے تھے مقدمے بناتے تھے اور مجرمان کو پکڑتے تھے۔ پر یہ دھندہ پھر بھی چلتا رہتا تھا۔ شک گذرا کہ ہو نہ ہو اس پر بڑے افسران کا سایہ ہے۔ پر "رانی کو کون کہے آگا ڈھک" بات پردے تلے ہی رہ جاتی۔

ایک دن ہم نے دامودر دادا کو اچھے مزاج میں دیکھ کر پوچھ ہی لیا کہ آخر راز کیا تھا۔ کہ اس کے ریستوران کے سامنے پتے کھیلنے والے جواری تو پکڑ لئے جاتے تھے۔ رکشا والوں کو معمولی پانسہ پھینکنے پر بھی جوتے پڑتے تھے۔ مگر اس پر سرکار کی خاص نظر کرم کیوں تھی؟

ایک زوردار قہقہہ بلند کرتے ہوئے دادا نے فرمایا کہ پچھلے چالیس سالوں سے صوبہ کے بڑے بڑے عہدے داروں کے کھانے پینے کا انتظام ان کے ذمہ چلا آتا تھا۔ جس پر ان کا اوسط خرچ دس ہزار روپے ماہوار ٹھہرتا تھا۔ بس اسی لئے ہر بدلتی حکومت ان پر مہربان رہی تھی۔ انہوں نے بڑے طمطراق سے کہا کہ ہم کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ ہماری سرکاریں اکثر غریب ہی ہوتی ہیں۔ جمہوریت میں بھلا امیر کون ہو سکتا ہے۔ چھوٹے ملازمین تو سادہ زندگی بسر کر لیتے ہیں۔ روکھی سوکھی کھا کر گذر اوقات کر لیتے ہیں مگر یہ بڑے بڑے عہدے دار اور ان کے بیوی بچے مرغن کھانے اور عیش و آرام کی زندگی گذارنے کے عادی ہوتے ہیں پھر افسران کی تنخواہیں ہی کیا ہیں۔ لے دے کر انہیں مشکل سے تین چار ہزار روپے ملتے ہیں اور اتنی رقم میں ان کا ایک شوقین بچہ بھی نہیں پل پڑھ سکتا اس لئے انہیں دان کی رقوم پر پلنا پڑتا ہے۔ اور دان۔ دان۔ تو صرف ان جیسے لوگ ہی کر سکتے

ہیں۔ اس لئے انہوں نے اور ان کے دوسرے ہم پیشہ ساتھیوں نے ایسے یتیم لوگوں کی پر دیش کا ذمہ لیا ہوا ہے۔ ایسا کرنے سے بگڑتا بھی کیا ہے۔ یہ تو ندی میں سے چُلّو بھرنے والی بات ہے۔ پھر آپ نے مہاتما کبیر کی بانی میں پڑھا ہی ہو گا کہ "دان دیئے دھن نہ گھٹے" اگر کوئی چلو میں ہی الو ہو جائے تو اسے اور کیا کہنا۔

ہم تو ٹھہرے عام شہری۔ ہمیں دامودر داد کی بات سمجھ نہ آئی۔ پھر پوچھ ہی بیٹھے کہ اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت تھا۔ کہ ویسے بڑے بڑے عہدے دار اور ان کے بیوی بچے ایسی غیر قانونی آمدن میں شریک ہوئے تھے۔ دادا نے ایک بار پھر پُر زور قہقہہ لگایا اور راز بھرے لہجہ میں کہا کہ اگر یقین نہ ہو تو چوری چھپے دیکھ لینا کہ سرکاری آرام گاہوں میں خورد و نوش کا انتظام کیسے ہوتا ہے اور اگر پڑھے لکھے ہو تو سمجھ لینا کہ وہ سرکاری طور پر بل سفر خرچ کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔

دامودر دادا کی راز دارانہ باتیں آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے۔

جب کسی نے مزاج پوچھا ہے
تو بہت مجھ کو یاد آیا ہے

ایک سیدھا سا سوال

ہم ماہر اقتصادیات یا علم ہندسہ تو نہیں مگر ایسا بھی نہیں کہ دو اور دو کو پانچ کہتے ہوں۔ آخر تعلیم یافتہ ہیں خانہ دار ہیں اور خانہ داری کی جمع تفریق اکثر کرتے رہتے ہیں۔ مگر جمہوریت کے پردے میں سبھی ایک دوسرے کو اندھا سمجھتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں حکومت کی چھڑی ہوتی ہے وہ دوسروں کو مویشیوں کی طرح ہانکنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ جمہوریت وہ نظام حکومت ہے جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی جماعت حکومت چلاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کے سامنے جوابدہ بھی ہوتی ہے۔ جمہوریت کی یہی تعریف ہے جس نے ہمیں موجودہ حکومت کے چنے ہوئے نمائندوں سے ایک سوال پوچھنے کی جرات بخشی ہے۔

آپ سب جانتے ہیں کہ جونہی ہندوستان کو آزادی ملی تب سے ہی ارباب حکومت غریب عوام کی قسمت بدلنے کے دعادی کرتے آرہے ہیں۔ غریبی ہٹاؤ غریبی ہٹاؤ کے مسلسل نعرے سن کر بیچارے غریبوں کے کان بہرے ہوگئے ہیں۔ ان کی قوت سماعت پر غریبی نے اتنا اثر نہیں کیا تھا جتنا غریبی ہٹاؤ کے نعروں نے۔ ایک فاقہ کش کے لئے فاقہ کاٹنا اس بات سے آسان ہے کہ اسے لٹکتی ہوئی روٹی دکھلا دی جائے جہاں تک اس کے ہاتھ نہ پہنچ سکتے ہوں۔ اور کسی حیل سے بھی وہ نوالہ توڑ کر منہ میں نہ ڈال سکتا ہو البتہ لالچ کی رال اس کے منہ سے ٹپکنی شروع ہو جائے گی۔ جو اس کی قوت مدافعت کو بھی کمزور کرے گی۔

حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے۔ ڈیم پہرہل۔ بجلی گھر اور کارخانے تو بہت بنائے گئے ہیں۔ ان سے ہونے والی آمدن بھلے ہی لوگوں کو راحت پہنچانے میں معاون ثابت ہوئی ہو مگر کچھ ایسے ذرائع آمدن بھی ہیں جو ہر آنکھ کان والا دیکھ اور سن سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہم صرف ہند و پاک سرحد پر پکڑے جانے والے سونے اور ہیروئن کی بات کرتے ہیں۔ پچھلے کچھ سالوں سے کروڑوں بلکہ اربوں روپے کی مالیت کا سونا اور ہیروئن صرف پنجاب کے ساتھ لگنے والی پاکستانی سرحد پر پکڑے گئے ہیں حکومت اور نیم فوجی دستوں نے اس کامیابی پر بہت شہرت حاصل کی ہے یہ کارکردگی واقعی قابلِ ستائش ہے۔ لہٰذا حکومت اور حفاظتی دستوں کا اس پر فخر کرنا قدرتی ہے۔ ہم دل سے ان کی بہادری کی تعریف کرتے ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی اشیا جو سمگلنگ کے دوران پکڑی جاتی ہیں اور جن کی قیمت بین الاقوامی منڈیوں میں کروڑوں میں تعین ہوتی ہے۔ جاتی کہاں ہیں کیا اس قدر بھاری رقوم پاکر بھی کوئی صوبہ یا ملک غریب رہ سکتا ہے؟ ہم سمجھتے ہیں سال رواں میں ہی اکیلے پنجاب بارڈر پر اربوں روپے کی ہیروئن پکڑی گئی ہے اگر واقع ہی وہ ہیروئن ہے اور اس کی قیمت بھی اتنی ہی ہے جس کا دعویٰ کیا گیا ہے تو پھر اس رقم کو غریبی ہٹاؤ پروگرام میں استعمال کیوں نہیں کیا جاتا۔ اس قدر بھاری رقوم سے آسانی سے بہت سے غریبوں کو روٹی کپڑا اور مکان مل سکتے ہیں۔ اور اگر اس رقم کو نیم فوجی دستوں کو جدید اسلحہ مہیا کرنے پر خرچ کیا جائے تو نہ صرف ان کے حوصلے بلند ہوں گے بلکہ پاکستان سے تربیت پاکر آنے والے انتہاپسندوں کو بھی اور دلیری سے قابو کریں گے۔ جس کا اثر ملک کے اندرونی نظم و نسق پر اچھا پڑے گا۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ عوامی حکومت اس طریق پر اکٹھی کی گئی رقوم کے بارے عوام کو مطلع کرے جس سے اگر غریبی نہیں تو کم از کم ذہنی شکوک تو دور ہوں گے۔

اندھے۔ بہرے۔ گونگے دیوتا

حضور! بہت سے لوگ ننگ دھڑنگ سڑکوں پر بھوک سے بلک رہے ہیں۔ ان کے معصوم بچّے نیم مردہ حالت میں پٹڑیوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ جنہیں کچھ ہوش ہے وہ گلیوں اور بازاروں میں سبزیوں کے چھلکے کوڑے کرکٹ سے اٹھا کر کھا رہے ہیں درمیانہ طبقہ کے لوگ متعدد بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اُن کے بچوں کے چہروں پر خون کا قطرہ نظر نہیں آتا۔ چیتھڑوں میں لپٹی جوانیاں نیم عُریانی کی حالت میں افلاس کی وجہ سے بہکنے لگی ہیں۔ سیاسی رہنما رہنمائی کے بجائے راہزنی کی طرف راغب ہو چکے ہیں۔ دفتروں میں رشوت کے بازار گرم ہیں بغیر پیسوں کے ایک میز سے دوسری میز پر کاغذ نہیں جاتے۔ عدالتوں میں جو انصاف کے مندر سمجھے جاتے ہیں اہلمدان کھلے عام پرائیویٹ فیس اکٹھی کرتے ہیں۔ سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی چیکنگ کرتے وقت جیبوں کی تلاشی لی جاتی ہے۔ سکولوں، کالجوں میں پڑھائی برائے نام رہ گئی ہے۔ جب امتحانات آتے ہیں نقلیں کھلے طور پر کی جاتی ہے۔ چاقو، چھرے اور پستول تک دکھلائے جاتے ہیں۔ خود ممتحن امتحانات کو ذریعہ آمدن سمجھنے لگے ہیں۔ ریلوے اسٹیشنوں پر سیٹ بُک کرنے کے لئے اصل کرایہ کے علاوہ کچھ اور بھی دینا پڑتا ہے۔ امیرزادے سڑکوں پر غنڈہ گردی کر رہے ہیں۔ راہ چلتی لڑکیوں کو مذاق کئے جاتے ہیں۔ بازار کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے۔ شہر اور بازار گندگی سے بھرپور ہوتے ہیں۔ اور اسی طرح کتنا کچھ دیکھنے کو ملتا ہے ..... کیا آپ نہیں دیکھتے؟

یہ آپ کس ملک کی بات کر رہے ہیں ہم تو جس شہر میں جاتے ہیں۔ خوبصورت دروازے ہمارا استقبال کرتے ہیں۔ بینڈ باجے بجتے ہیں۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس خوبصورت بچے ہمیں ہار پہناتے ہیں۔ کتنے ہی سفید پوش لوگ ہمیں خوش آمدید کہنے کو آتے ہیں۔ ہم نے کبھی کسی بھوکے ننگے اور بداخلاق انسان کو نہیں دیکھا جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔ ہمیں ایسی کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی۔

حضور! یہ ہائے روٹی۔ ہائے روٹی! کی کلیجہ چیرنے والی آوازیں۔ معصوم بچوں کا بیماری سے کراہنا۔ بوڑھوں اور بے سہاروں کا اونچی آہیں بھرنا نوجوان، کنواری لڑکیوں کی چیخ و پکار۔ گلیوں اور بازاروں میں مہنگائی کی وجہ سے مچی ہاہاکار دفتروں اور عدالتوں میں رشوت کا دور اسکولوں اور کالجوں میں آئے دن ہڑتالوں اور بندوں کا شور۔ کیا آپ کچھ بھی نہیں سنتے؟

ارے پگلے! ہم تو جہاں بھی جاتے ہیں بہترین لذیذ کھانوں کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ پھولوں کی طرح خوبصورت بچے غبارے لے کر ہمارا سواگت کرتے ہیں۔ اور سریلی آوازیں میں گانے گاتے ہیں بہت بزرگ اور پرانے لوگ اونچے اونچے نعرے لگاتے ہیں۔ ہر چیز راشن ڈپوؤں پر لائینوں میں ملتی ہے۔ کوئی شور نہیں ہوتا۔ عدالتوں میں امن امان سے عدل ہو رہا دیکھتے ہیں۔ سکولوں، کالجوں میں پریڈیں ہوتی ہیں۔ اور دیش پریم کے قومی گانے سنتے ہیں۔ مگر جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں۔ وہ تو کبھی ہمارے کانوں میں نہیں پڑا۔ ہمیں ایسی کوئی دردناک آواز سنائی نہیں دیتی۔

حضور! کچھ مظلوم لوگ فریاد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے جھونپڑے جلا دیئے گئے ہیں۔ کچھ بھوکے روٹی کے طلبگار ہیں۔ ان کے پاس کوئی ذریعہ معاش

نہیں۔ کچھ ابتلائیں اپنی دردناک کہانیوں کے جواب میں آپ کی زبانِ مبارک سے کچھ سننا چاہتے ہیں ہر طرف سے یہی آواز آرہی ہے کہ ہماری مانگوں کا جواب دو۔ ہمیں کچھ تو بتلاؤ۔ کچھ تو کہو ہم کیا کریں۔ کدھر جائیں۔ کیا کھائیں ہم ....

اور حضور نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے آنکھیں بند کر لیں اور منہ کو بند بٹوے کی شکل دے کر خاموش بیٹھے رہے۔

سمال فرائی

ایک بہت بڑے سرکاری افسر کو جب اُس کے ایک ماتحت کی رپورٹ پر کچھ ندامت اٹھانی پڑی تو اُسے یہ بات سخت ناگوار گذری۔ اُس نے بذریعہ حکم خاص اس ماتحت کو اپنے روبرو پیش ہونے کو کہا جب وہ مظلوم ماتحت آداب بجا کر خاموش کھڑا ہو گیا تو اُس مغرور افسر نے سلسلہ کلام شروع کیا۔

افسر: تم اپنے آپ کو بہت لائق سمجھتے ہو؟

ماتحت: نہیں حضور میں تو ایک ناچیز و کمترین ماتحت ہوں مجھے عقل کہاں؟

افسر: تو پھر اس قدر قلم کیوں چلاتے ہو؟

ماتحت: حضور میں سچے حالات افسرانِ بالا کے نوٹس میں لانا چاہتا ہوں۔

افسر: یو آر اے سمال فرائی، یو نو اِٹ؟

ماتحت: جی حضور! تبھی تو ہم ماتحت کمترین لکھتے ہیں۔

افسر: بکومت میں تمہیں محکمہ سے سبکدوش کردوں گا، کچل دوں گا۔

ماتحت: حضور!

اتنے میں فون پر گھنٹی بجی کوئی وزیر صاحب بول رہے تھے۔

وزیر۔ کیوں جی آپ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں۔

افسر۔ سر میں تو آپ کا ایک ادنیٰ ملازم ہوں

وزیر۔ جانتے ہو میرے قلم کا ایک لفظ تمہیں گھر بھیج سکتا ہے۔

افسر: سر میں تو آپ کے رحم وکرم پر جی رہا ہوں

وزیر۔ یو آر اے اسمال فرائی یو شُڈ نو اٹ

افسر۔ حضور!

ماتحت اُس افسر کی گڑگڑاہٹ سنتا رہا اُس کے دل میں ایک سوال اٹھا

"ہُو از دا اسمال فرائی"؟

وہ یا اُس کا افسر؟

درائیں

- ہمیں خود کو ہندوستانی کہنے کہلانے میں فخر ہونا چاہیئے نہ کہ ٹھکر، ہریانوی پنجابی ہماچلی، راجستھانی وغیرہ
- سرکاری دفاتر میں دھارمک شخصیتوں، اوتاروں، گوروؤں وغیرہ کی تصاویر نہیں لگانی چاہئیں کیونکہ ان سے فرقہ پرستی بڑھتی ہے۔
- ملازمین سرکار کو ایک دوسرے کو ملتے وقت خاص طور پر جبکہ وہ کار سرکار کے سلسلہ میں ملیں تو ماسوائے "جے ہند" کے کسی اور طریق پر مصافحہ نہیں کرنا چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں نمستے، سلام، ست سری اکال وغیرہ کا استعمال نہیں کرنا چاہیئے
- دھرم انسان کی عاقبت سنوارنے اور سیدھے راستے پر چلانے کا ایک طریقہ ہے نا کہ سیاست اور سرکاری کاموں میں برتنے کا حربہ، حتی الوسع سیاست اور ملازمت سرکار میں دھرم اور مذہب کے نام پر کوئی رو رعایت نہیں ہونی چاہیئے۔
- ملازمان سرکار اور خاص طور پر ڈسپلنڈ فورسز میں مذہب اور فرقہ کی بنا پر کسی قسم کا امتیاز نہیں برتنا چاہیئے بلکہ ہر کام میں میرٹ کو سامنے رکھنا چاہیئے
- کار سرکار میں تنگ نظری، فرقہ پرستی اور جذبات کی رَو میں بہہ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے۔
- سرکاری دفاتر میں سچ بولو، ہمیشہ انصاف کرو، رشوت نہ لو اور فرقہ پرستی سے باز رہو۔ جیسے موٹو لگائیں جن سے پڑھنے سننے والوں کو ان اصولوں کی یاد

تازہ رہے۔

- ملک کی بہبودی کو ہر حالت میں فضیلت دیں
- خود غرضی اور خود پرستی چھوڑ کر ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا چاہیئے۔
- خدا کا نام بیچنے کی بجائے خدا کی وحدت پر متزلزل یقین رکھنا چاہیئے

منہ کالا کرنے والے

بچپن اور جوانی کی طرح بڑھاپا بھی زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔ بڑھاپا ہر پیدا ہونے والے جاندار پر آتا ہے۔ وہ کچھوا ہو یا کیڑا۔ گیدڑ ہو یا شیر۔ سب بوڑھے ہوتے ہیں۔ جہاں دوسرے سارے جانور بڑھاپے کو خوش آمدید کہتے ہیں وہاں جناب انسان اس سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ جسم پر پیدا ہونے والی جھریاں چھپائی جاتی ہیں۔ رنگت کو مصنوعی طریقوں سے نکھارا جاتا ہے اور بیش قیمت غذائیں اور دوائیں کھا کر جسم کو فوجی زبان میں سادھان رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے ان سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے بالوں کو سیاہ کرنے پر۔ کیونکہ عام طور پر بالوں کا سفید ہونا ہی بڑھاپے کو ظاہر کرتا ہے کسی کی اندرونی طاقت یا مردانگی کا دیکھنے سے بھلا کیا جائزہ ہو سکتا ہے۔ البتہ اگر کسی کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال سفید ہوں تو وہ بیدھے بڑھاپے کی کھڈ میں گرا نظر آتا ہے۔ بہت چھوٹی عمر ہماری مراد بیس تیس سال میں اگر بال سفید ہو جائیں تو بھی چہرے کی بناوٹ اور رنگت منہ سے بول دیتی ہے کہ ابھی تو ہم جوان ہیں مگر چالیس اور اس سے اوپر اگر بال سفید ہو جائیں تو یقیناً یہ بڑھاپے کی آمد کی نشانی ہے۔

کسی دانا نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ باچیش بجنا کرد روسیاہ خام یعنی جو لوگ مہندی لگا کر چہرہ رنگتے ہیں وہ دراصل اپنا منہ آپ کالا کرتے ہیں یہ عمل ایک خاص فرقہ کو خاص طور پر ممنوع ہے اور مذہبی اصولوں کے سخت خلاف ہے۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قوم کے دانشور گرتی عمر میں منہ کالا کرنے کی طرف

کیوں راغب ہیں۔ وہ یقیناً ایسا کر کے بھی جوان نظر نہیں آتے۔ کسی کے ہاتھ پاؤں کانپتے ہیں تو کسی کے منہ سے رال ٹپکتی ہے۔ کسی کی توند نکلی ہوئی ہے تو دوسرے کو دل کا عارضہ ہے۔ غرضیکہ جسم کے اعضائے رئیسہ جواب دے چکے ہیں پھر سمجھ نہیں آتی وہ اپنا منہ کالا کرنے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ کون اعتبار کرے گا ان پر تبھی تو جناب ریاض نے فرمایا تھا۔

حنا لگا کر نکلتے ہیں مگر خوں میں ریاض،
کچھ ان کی ریش مقدس کا اعتبار نہیں

یہ حرص کی انتہا ہے کہ لوگ امارت اور سیاست کے بام پر پہنچ کر ان کے سہارے خود کو جوان ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود کو جوان سمجھتے ہیں یا نہیں یہ تو وہی جانتے ہیں مگر صاحب حقیقت تو حقیقت ہی رہتی ہے۔ ہاں وہ سیاست کی کرسی کی طرح جوانی کو بھی نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ان پر کسی شاعر کے کلام کا بھی اثر نہیں ہوتا۔ لیجیے آپ حنا زہرہ نگاہ کا یہ شعر پڑھیے اور پہچانیے ان لوگوں کو۔

یہ کیا ستم ہے کہ پیر مُغاں وہی ہے ابھی
نئی ہے بزم نئی مے نئے پیمانے

• ایک چھلانگ لگانے سے انسان کنویں میں گر سکتا ہے لیکن سو بار چھلانگ لگانے سے باہر نہیں آ سکتا ہے۔

بند کرو یہ بند

یوں تو ہندوستان میں بند کا رواج فرنگیوں کے دورِ حکومت سے چلا آ رہا ہے۔ اسے ہم توڑ مروڑ کر بابائے قوم یعنی راشٹر پتا مہاتما گاندھی کے اسہیوگ آندولن سے جوڑ سکتے ہیں۔ اسی کڑی میں اس کا رشتہ اہنسا سے بھی جُڑ سکتا ہے۔ انگریزوں کی حکومت سخت تھی اور وہ جابرانہ ڈھنگ سے ہندوستان کی ہر تحریک کو دبا دیتے تھے۔ عام جلسے جلوسوں میں بھی بیچارے دیش واسیوں پر لاٹھی چارج ہو جاتے تھے اور کبھی کبھار گولی کا استعمال بھی کر لیا جاتا تھا۔ یہاں ہمیں آپ کی یاد تازہ کرنے کے لئے کچھ مثالیں دینی ہوں گی۔ ہماری مراد گورو کا باغ کا مورچہ جلیانوالہ باغ کا قتلِ عام اور جیتو کے مورچے سے ہے ان دنوں ایسے مورچے سنگ دل انگریز حکومت کے بہرے کانوں تک آواز پہنچانے کے مقصد سے لگائے جاتے تھے۔ بلاشبہ وہ سارے کامیاب بھی ہوئے تھے اور ہندوستان کو آزادی دلانے میں ان کا نمایاں رول ہے۔

مگر آزادیٔ وطن کے بعد اپنی ہی سرکار رہی ہے۔ چاہے وہ کانگرسی ہو۔ یا اکالی ہر حال میں وہ عوام کے منتخب شدہ نمائندے ہی ہوتے ہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ عوام نے بہروں گونگوں بلکہ اندھوں کو ملک کا نظم و نسق چلانے کے لئے اپنے ہی ہاتھوں سے منتخب کیا ہو۔ ہاں یہ تو ممکن ہے کہ ایسے صحیح الدماغ نمائندے جن کی قوت بصارت و سماعت درست ہو حکومت کے نشے میں اندھے ہو جاتے ہوں اور کھلی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دیکھ سن نہ سکتے ہوں۔ اور پھر اپنی آواز بلکہ فریاد ان کے کانوں

تک پہنچانے کے لئے محبوب عوام کو بند کا سہارا لینا پڑتا ہے مگر حضور بھلا اندھا کیا دیکھے گا بہرہ کیا سنے گا اور فاتر العقل عقل کی بات کرے گا کبھی نہیں بلکہ ہرگز نہیں

آیئے اب لمبی چھلانگ لگا کر دور حاضر پر طائرانہ نظر ڈالیں جب سے دہشت گردوں نے پنجاب میں چاند ماری شروع کی ہے یہ بند کی بیماری بھی عام ہو گئی ہے۔ ادھر کچھ امن پسند شہریوں کا بے دریغ قتل ہوا ادھر حکومت نے کرفیو کے نفاذ کا حکم جاری کیا۔ پہلے پہل عوام کے اغلب بند کو بند کرنے کے لئے گویا حکومت خود بند لگا دیتی تھی۔ پولیس راج شروع ہو جاتا تھا اور کئی کئی دن لوگوں کے ٹٹی پیشاب بند رہتے تھے کیونکہ ہر گھر میں فلش وغیرہ کی سہولیات نہیں۔ بیشتر لوگ شہر کی بیرونی زمین زرخیز کرنے کے لئے قدرتی کھاد ڈالتے ہیں جب گھر کی چوکھٹ پر بھو کے بندوق دھاری کرمچاری بیٹھے ہوں تو باہر جانے کی جرات کون کر سکتا ہے۔ ناک میں دم آنے کی وجہ سے لوگ شرافت کا ثبوت دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کرفیو ختم کر دیا جاتا ہے پھر کسی بیدار مغز منتظم نے یہ سمجھ لیا کہ بار بار کرفیو لگوا کر دہشت گرد یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حکومت کا کوئی رعب نہیں بس بندوق کی نوک پر دن کاٹ رہی ہے۔ انہوں نے کرفیو لگانا بند کر دیا بار بار سرکار کو شکست خوردہ جان کر غیر سرکاری تنظیموں نے ذمہ داری سنبھال لی اور جونہی دہشت گردوں نے دو چار قتل کئے۔ دو کانوں کے شٹر ڈاؤن ہوئے۔ ایسی تنظیموں کے بلا تنخواہ چودھری بڑی جانفشانی سے اپنے ساتھیوں کی مدد سے دوکانیں بند کروا دیتے ہیں سڑک پر پہیہ جام کروا دیتے ہیں اور سکولوں کالجوں میں بے موسمی چھٹی ہو جاتی ہے نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ عوام الناس کو بے آرامی ہوتی ہے۔ کھانے پینے کی چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں دور نزدیک جانے کو سواری نہیں ملتی اور بچوں کی تعلیم کا ہرج ہوتا ہے۔ جن کے لئے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے ان کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی۔ بلکہ جو کام انہوں نے ہزاروں باوردی ملازمین تعینات کر کے کرنا ہوتا ہے وہ خود بخود لوگ کر دیتے ہیں

ہاں کچھ لوگوں کو چودھر چمکانے اور لیڈری چمکانے کا موقعہ ضرور مل جاتا ہے پچھلے سات برسوں میں سب کو تجربہ ہو چکا ہے کہ یہ بند کی بات کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے والی ہے وہ چاہے آنکھیں بند کر کے بلی کو نہ دیکھے اور مرتے دم تک خوش فہمی کا شکار رہے مگر اسے بلی کا شکار بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ گویا اس نے آنکھیں بند کر کے خود کو موت کے حوالے کر دیا۔

ہم سمجھتے ہیں آئے دن بند کر کے لوگ اپنی اور دوسروں کی روزی بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں بیوپار کو دھکا لگتا ہے مزدوروں کے پیٹ میں لات لگتی ہے اور چاندی بنتی ہے سرکاری اہلکاروں کی یا پھر برساتی لیڈروں کی۔ سرکار تو خاموش تماشائی بنی رہتی ہے ہاں دہشت گردوں کو اپنی کمینی کوششوں میں کامیابی نظر آتی ہے۔ اور وہ موقعہ پا کر پھر ضرب لگانے سے باز نہیں آتے۔

مندرجہ بالا امور کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ایک شہری کی حیثیت سے عوام اور سرکار سے ہمدردی رکھتے ہوئے گذارش کرتے ہیں کہ بند کرو یہ بند اور خدا کا نام لے کر دہشت گردوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤ۔ ہمیں یقین کامل اور امید واثق ہے کہ آپ کی ہمت اور حوصلے کو بلند دیکھ کر وہ دم دبا کر بھاگ جائیں گے۔

-:-

کھدر مڈل ڈاکٹر

ڈگری نہ رکھتے ہوئے بہت سے "کھدر مڈل" لوگ بھی ڈاکٹر بن چکے ہیں۔ میری مراد ان ڈاکٹر صاحبان سے نہیں ہے جو ڈاکٹری کی دوکانیں محض گاؤں کے نام سے کھول لیتے ہیں۔ جیسے ڈاکٹر کرم چند غوطے والا۔ ڈاکٹر بلبیر کھومہ یا ڈاکٹر سبھاش پھیرومان۔ ایسے ڈاکٹر صاحبان نہ تو ایم بی بی ایس ہوتے ہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی امتحان پاس کیا ہوتا ہے۔ بس کسی ویئد ڈاکٹر کی دوکان پر پڑیاں بنانے اور ٹیکہ لگانے کی مہارت حاصل کرنے کے بعد اپنی دوکانیں کھول لیتے ہیں۔ یہاں ہماری مراد ان ڈاکٹر صاحبان سے ہے جو ادبی اور لسانی شعبوں میں ڈاکٹر کی ڈگری اعزازی طور پر حاصل کرتے ہیں۔

ایسے ہی ایک ڈاکٹر صاحب جو محض سیاسی طاقت کی بنا پر ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے بعد پہلی بار اپنے آبائی گاؤں گئے اور انہیں گھر پر کچھ پڑھے لکھے لوگوں نے ڈاکٹر صاحب کہکر پکارنا شروع کردیا۔ وہ اس لقب پر بہت اترا رہے تھے۔ گھر کی ایک بوڑھی عورت نے جو بعارضہ زکام اور سردرد بیمار تھی انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا:۔

"وے جگو! توں تے ڈاکٹر ایں کوئی گولی تے دے مینوں سمکا تے سر پیڑ اے"
دارے جگو۔ تو تو اب ڈاکٹر ہے۔ مجھے کوئی گولی دو مجھے زکام اور سردرد ہے) اور جگو یا ڈاکٹر چودھری جگن ناتھ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ وہ کیا بتاتا کہ وہ کونسا ڈاکٹر ہے۔ ہے بھی یا نہیں

اتنے میں کسی نے پھر خطاب کرتے ہوئے کہا، ڈاکٹر صاحب۔ گاڑی تیار ہے۔ تشریف لایئے۔ اگلی جگہ لوگ آپکی تقریر سننے کو بیتاب ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب بڑھیا کو کوئی جواب دیئے بغیر چلے گئے۔

چور ڈاکو لٹیرے

میں نے تمام انسانوں کو ایک جیسے پیدا کیا تھا کوئی بھی بطن مادر سے قیمتی لباس اور ہیرے جواہرات پہن کر نہیں آیا تھا۔ ہاں جو کچھ وہ پچھلے جنم میں کرتا رہا ہے۔ اس کے عوض اُسے ان حالات کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ جن کا کہ وہ مستحق تھا۔ اس میں سہولیاتِ زندگی ضرور مہیا کی گئی تھی۔ اس طرح پیدائش میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ایک درخت کی شاخوں پر لگے پتّوں میں بھی ہو بہو مطابقت نہیں ہوتی۔ ایک ہی ڈال پر لگے پھولوں کی پتیوں میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر وہ پتے اور پھول ایک سے ہی نظر آتے ہیں۔ یہی قانون انسانوں پر بھی ہو بہو لاگو ہے۔

وہ کون سا پتّہ یا پھول ہے جو دوسرے پتوں یا پھولوں کو مسل مروڑ کر خود نمایاں شکل اختیار کر لیتا ہے؟ جواب نفی میں ہی ملے گا۔ تو پھر انسانوں کی صفوں سے اٹھے شہنشاہ۔ راجے مہاراجے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے سیاسی حکمران عام انسانوں سے کیسے مختلف ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے جنگ و جدل سے علاقائی فتوحات کر کے غریبوں۔ کمزوروں۔ بے بسوں اور نیک انسانوں پر جبر و ظلم کر کے ان کی جائیداد پر قبضہ کر کے جو حکومتیں قائم کی تھیں۔ وہ عقل اور انصاف کے بعید تھیں۔ انہوں نے دوسروں کا مال ہڑپ کیا تھا۔ ان کی عزت و ناموس کو ٹھکرایا تھا۔ ان کی حسین بہو بیٹیوں کو اپنی حرم سراؤں میں زبردستی داخل کیا تھا۔ اور اس طرح وہ شہنشاہ راجے مہاراجے۔ سلطان اور سردار کہلوائے۔ یہ زبردستی تھی اس لئے میں

کہتا ہوں کہ وہ سب چور تھے۔ ڈاکو تھے۔ لٹیرے تھے۔

میں نے تمہیں آنکھیں دیں کہ تم دیکھ سکو۔ کان دیئے کہ تم سن سکو ناک دیئے کہ سونگھ سکو اور دل و دماغ دیئے کہ تم سوچ سمجھ کر حق و باطل کی پہچان کر سکو اور صراطِ مستقیم پر چل سکو۔ مگر تم نے ان اعضاء رئیسہ کا صحیح استعمال نہیں کیا۔ یا پھر ان سے بالکل ہی مستفید نہیں ہوئے۔ اور تو اور تم نے میرے وجود کو دیکھ کر۔ سن کر۔ سونگھ کر۔ اور سوچ کر بھی نہیں سمجھا۔ جہالت کے پردہ تلے دبی تمہاری عقلیں مجھے اینٹ پتھروں کی عمارتوں اور کتابوں میں قید سمجھ رہی ہیں۔ زمین و آسمان بیابان۔ جنگل اور پہاڑ۔ تیز رو دریا اور عمیق سمندر بھی تمہیں نظر نہیں آتے۔ کیا ان کی موجودگی میں تمہارے چھوٹے چھوٹے تالاب۔ کلس اور مینار کچھ معنی رکھتے ہیں۔ بھلا میں پاگل ہوں جو انہیں چھوڑ کر ان مصنوعی آشیانوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤں گا۔ جب تم ایک کشادہ کوٹھی کو چھوڑ کر ایک جھونپڑی میں جانا پسند نہیں کرتے بلکہ پیٹ رینگنے والا ایک حقیر کیڑا بھی اپنا بل چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر میں جانا گوارا نہیں کرتا تو پھر میں جس نے ساری کائنات کی تخلیق کی ہے کیوں ایسا کروں گا۔

دراصل ایسی عبادت گاہیں محض دنیاوی مقاصد حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں۔
میرے اور مذہب کے نام پر ان آماجگاہوں میں سیاسی اور انسان دشمن کارروائیوں پر ہی غور و فکر کیا جاتا ہے۔ جن کا مقصد دنیاوی طاقت حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔ یہی حمد میں کی جانے والی عبادت محض بھولے بھالے لوگوں کو پھنسانے کا طریقہ ہے۔ تمہاری شاطرانہ چالوں سے

میں تنگ آگیا ہوں ۔

بڑا دائرہ

ہے ہر جگہ موجود ہے لیکن نظر آتا نہیں
راز اپنا وہ کسی بندے کو بتلاتا نہیں

آخر وہ کون جادوگر ہے ۔ جو سب کے سامنے آنے پر بھی نظر نہیں آتا۔
لوگ اُسے بھگوان، خُدا، اللہ، گاڈ اور واہگورو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کی شان دوبالا کرنے کے لئے کروڑوں ہی نہیں۔ بلکہ اربوں کھربوں روپے خرچ کر کے مندر۔ مسجدیں۔ گرجے اور گوردوارے بنائے جا چکے ہیں۔ ہم نے ایسے تمام مقامات پر اس پردہ نشین۔ شرمیلے دلبر کی تلاش کی۔ مگر وہ کسی شکل میں بھی نمودار نہ ہوا۔ ان تمام جگہوں پر حضرتِ انسان کی بنائی مصنوعی چیزیں پڑی تھیں۔

جب ہم نے اس بارے میں مذہبی پیشواؤں سے رجوع کیا۔ تو انہوں نے یہ کہہ کر بات ٹال دی۔ کہ برخوردار اس قادر مطلق کو دیکھنے کے لئے ایک خاص نظر کی ضرورت ہے۔ جب ہم نے سوال کیا کہ وہ خاص نظر کیسے میسر آئے گی۔ تو فرمایا کہ مستقل ریاضت اور یکسوئی سے۔ ہم سمجھ چکے تھے کہ محض بات ٹالنے کا بہانہ تھا، لہذا ہم نے عالم خیال میں اس ہر جگہ موجود مگر نظر نہ آنے والے ساحر سے ملنے کی ٹھانی۔

خیالی پرواز میں تو تکان کا کچھ احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم دنیا کے ہر گوشے سے ہو آئے۔ عمیق سمندروں کی عرق ریزی کی مگر اس کا وجود کہیں بھی نظر نہ آیا۔

بالآخر ہم نے آسمانوں کی طرف رُخ کیا۔ کتنے ستارے اور سیارے ہماری راہ میں آئے کتنے چاند اور سورج کو ہم پیچھے چھوڑ گئے۔ ہم دنیا و مافیہا سے بہت دور جا چکے تھے۔ پھر ایک لا محدود خلا میں پہنچ کر جب ذرا غور سے دیکھا۔ تو وہاں کچھ ہوائی گولے دائرے) سے اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے، حیرانی اس بات پر ہوئی۔ کہ جب وہ ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔ تو کوئی شور نہیں ہوتا تھا۔ کوئی آواز نہ اٹھتی تھی۔ اور کوئی شعلہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ان ہوائی گولوں کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے بیچ سے گزر کر بھی اپنی حالت قائم رکھتے تھے۔ ان ہوائی گولوں کے درمیان ایک ویسی ہی ساخت کا بہت بڑا دائیرہ نما گولہ تھا۔ ہم آہستہ آہستہ اس کے نزدیک پہنچے، وہ لاتعداد اور لا محدود گولے ہم سے ہزاروں بار ٹکرا کر واپس چلے گئے۔ ہمیں ان کی موجودگی کا احساس ضرور ہوتا تھا۔ مگر ہم ان کے وجود کو چھو نہ سکے ہم نے اس دائیرہ نما بڑے گولے کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا کہ ۔ یہ سب کچھ کیا تھا ۔ اور وہ مقابلتاً دوسرے گولوں سے بڑی ساخت کا کیوں تھا ۔ ؟

پھر وہ بڑا دائیرہ بول پڑا۔

"سیلانی! یہ چھوٹے دائرے آتمائیں ہیں اور ہم پرماتمائیں ہیں۔"

تو آپ تمام دنیا کو چکر میں ڈال کر یہاں کیوں چھپے بیٹھے ہیں"۔ میں نے سوال کیا۔

سیلانی! ہم دنیا کے شور و شر سے تنگ آ چکے ہیں۔ ہم نے ان آتماؤں کے دائروں کی طرح سب کو یکساں بنایا تھا۔ اس لئے کہ کوئی کسی دوسرے کا کوئی نقصان نہ کرے ہم نے اپنی سہولیت کے لئے حضرتِ انسان کو کچھ اختیارات دیئے تھے۔ تاکہ وہ نظام دنیا چلانے میں ہمارا امدادی ثابت ہو۔ مگر ہمارے ہی نام کو بدنام کرنے کے لئے اور اپنی غرض پوری کرنے کے لئے ہماری تخلیق نے ہمارے خلاف بغاوٹ کا پرچم اٹھا لیا۔ مذہب اور رنگ و نسل کے نام پر دنیا میں تفرقات ڈال دیئے۔

ہمیں اپنے شاہکار کی یہ حرکت پسند نہ آئی۔ اسے روکنے کے لئے ہم نے کئی بار مہان آتمائیں پیغمبروں کی شکل میں بھیجیں۔ مگر اس خود غرض انسان نے جو حشر ان کا کیا۔ وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے۔ اس طرح حضرتِ انسان کی نافرمانبرداری سے تنگ آ کر ہم یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔

اب ہم صرف روحوں کے درمیان رہتے۔

ایک مشورہ

اے نادان تو خود بے وقوف ہے ہی تو نے اپنے ساتھیوں کو بھی بیوقوف بنا دیا ہے اور اب مجھے بے وقوف بنانے کی سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ مگر یاد رکھ تو اس کوشش میں کبھی بھی کامیاب نہیں ہوگا۔

مَیں تیرے ناپاک ارادے کی ایک مثال پیش کرتا ہوں

تو میرے نام پر ایک مذہبی مقام بناتا ہے جس میں میری موجودگی کا دعویٰ ہی نہیں کرتا بلکہ اُسے میرا ٹھکانہ بتلاتا ہے۔ جیسے میں تیرا غلام اور پابند ہوں"

او کم عقل و کم ظرف انسان، کیا تو مجھے اس طرح قید رکھ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں مَیں تو ہر قید و بند سے آزاد ہوں۔ بھلا میں تیرے سونے اور سنگِ مرمر کے محلوں میں قید نہیں رہ سکتا ہوں؛

اب بھی باز آ اور میرے نام پر ایسے قید خانہ نہ بنا۔ اُن کے بننے سے میں قید نہیں ہوتا۔ اور ان کے مسمار ہونے سے مجھے کوئی ضرر نہیں آ پہنچتا۔

ہوش میں آ اور میرے نام پر ایسے مزار نہ بنا کیونکہ میں پابندہ ہوں۔ پیدائشی طور پر آزاد ہوں۔ تو بھی ایسے غلامانہ خیالات سے آزاد رہ۔

پھر مجھ میں اور تجھ میں کوئی فرق نہیں رہے گا!

خُدا سے اِنٹرویو!

مَیں : جناب! کیا مَیں اندر آ سکتا ہُوں ؟

خُدا :۔ ہم اندر باہر کی حُدود کے پابند نہیں۔ تاہم آپ آگے آ سکتے ہیں۔

ہم : جناب مجھے آپ سے مل کر بہت فخر محسوس ہو رہا ہے۔ شرفِ ملاقات کا شکریہ!

خ : اس کی ضرورت نہیں۔ آپ میری ہی تخلیق ہیں۔

ہم : اگر آپ محسوس نہ کریں تو کچھ سوالات کرنے کی جرأت کروں۔

خ : بصد شوق

ہم : کیا مندر۔ مسجد۔ گرجے۔ گوردوارے آپ کے حکم سے بنوائے جاتے ہیں۔ اور کیا آپ اُن جگہوں میں قیام فرماتے ہیں ؟

خ : (خدا کے چہرے سے خوشی غمی یا غصے کا تاثر نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ پرسکون رہتے ہیں) کیا انسان کی بنائی ہوئی کوئی مذہبی عمارت کوہ ہمالہ سے اونچی ہے؟ کسی مندر کا کلس۔ مسجد کا منارہ۔ گوردوارے کا نشان صاحب یا گرجے کی صلیب اتنی بُلند ہوتی ہے ؟ بالکل نہیں۔ پھر ہمیں ان اینٹ پتھروں کی عمارتوں میں پابند ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ رہا سوال ان جگہوں میں قیام کرنے کا۔ سو ظاہر ہے کہ ہم ہر جگہ اور ہر وقت موجود رہتے ہیں انسان کی بنائی ہوئی ان عمارتوں کی ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں ہے۔

م : اکثر دیکھا گیا ہے کہ مندروں گوردواروں کے ساتھ تالاب بنائے جاتے ہیں
خ : یہ تالاب محض نہانے دھونے کے لئے ہی ہیں۔ کیا یہ چھوٹے چھوٹے تالاب ہماری میلوں میلوں لمبی جھیلوں اور نہ ختم ہونے والے سلسلہ وار سمندروں سے بڑے ہوتے ہیں۔ اگر نہیں تو یہ بھی انسان کا اپنا شوق ہے یا فطری فعل ہے۔ ہماری مراد ہے کہ انسان نقل کرنے کا عادی ہے۔

م : اکثر لوگ آپ کا نام جپتے ہیں، بہت زیادہ بھجن بندگی کرتے ہیں کئی طریقوں سے آپ کی عبادت ہوتی ہے۔ کیا یہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ہے یا محض مطلب باری کے لئے ایسا کرتے ہیں؟

خ : دیکھئے میں نے اپنی مخلوقات کو اور خاص طور پر انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا کہ وہ مجھے بیٹھے بیٹھے یاد کرتے رہیں۔ اس سے نہ تو مجھے کچھ فائدہ ہوتا ہے اور نہ ہی میرے نام کی رٹ لگانے والے انسان کو ہماری نظر میں یہ چاپلوسی ہے۔ محض تو ضیع اوقات ہے۔ اس سے دُنیا میں کوئی تخلیقی کام نہیں ہوتا۔ ہم اسے ہرگز پسند نہیں کرتے۔

م : جناب کچھ ایسے بھی سنا گیا ہے کہ آپ اُن لوگوں سے ناراض ہو جاتے ہیں جو آپ کی عبادت نہیں کرتے۔

خ : یہ غلط ہے۔ ہم کبھی بھی کسی سے ناراض نہیں ہوتے۔ ہم تو ہم بڑی بڑی سلطنتوں کے صدر۔ حاکم اور گورنر وغیرہ بھی جب کسی کو کسی عہدہ سے برخاست یا تنزل کرتے ہیں تو یہی لکھتے ہیں کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ فلاں شخص کو اس کے عہدہ سے برخاست کر رہے ہیں۔ اس طرح ہم بھی ہمیشہ خوش ہی رہتے ہیں۔

م : یہ مذہب و ملت کی بیماری دُنیا میں کس نے بھیجی تھی؟

خ : یہ خود انسان کی پیدا کردہ ہے۔ ہماری نظر میں سب سے بڑا مذہب

انسانیت ہے۔

م : آپ کی مخلوقات میں شیر جیسے درندے اور سانپ ایسے زہریلے جانور بھی شامل ہیں۔ آخر ان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو انسان کے دشمن ہیں۔

خ : معلوم ہوتا ہے آپکی علمیت بہت کم ہے۔ ذرا اب تک شیروں، سانپوں سے مارے گئے انسانوں اور انسانوں کے ہاتھوں مرنے والے شیروں وسانپوں کے اعداد وشمار دیکھیں انسان نے ان معصوم جانوروں پر بہت ظلم کیا ہے ان کی نسل کشی کرنے کی حماقت بھی کی۔ مگر اس کے مقابلہ میں شیروں اور سانپوں نے تو گنتی کے لوگوں کو مارا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان شیروں اور سانپوں سے ظالم ہے۔ اب آپ ہی سوچیں کہ کون بُرا ہے۔

م : ایک اور سوال اور پھر بس

خ : ہاں ہاں شوق سے پوچھئے

م : خدا سے بڑھ کر بھی کوئی طاقت ہے؟

خ : بہت اچھا سوال ہے۔ خُدا سے بڑھ کر انسان طاقتور ہے۔ بشرطیکہ وہ مصمم ارادہ رکھتا ہو اور محض خدمتِ خلق پر یقین رکھتا ہو۔ انسانیت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرے۔ ایسے ارادے اور عزم محکم والا انسان یقیناً خُدا سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

(اور پھر مَیں اور خُدا جُدا ہو گئے)

ایک بار کر کے تو دیکھو

شکم مادر سے کون ہندو پیدا ہوا ہے اور کون مسلمان۔ کس کو عیسائیت کا علم تھا اور کون گوربانی گاتا ہوا آیا تھا۔ پیدا ہوتے وقت نہ تو کسی کے چوٹی تھی اور نہ ہی سنت نہ اُس کے گلے میں صلیب تھی اور نہ ہی سر پر جوڑا۔ پھر یہ فرقہ پرستی کی بیماری کیوں لگ جاتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اس قسم کی تنگ نظری کے بغیر مطلب پرستی کی ہوس پوری نہیں ہو سکتی۔ بقول شاعر ؎

ہندو بنوں گا نہ مسلمان بنوں گا!

اِنسان کی اولاد ہوں۔ انسان بنوں گا

کیا انسانیت اس میں ہے کہ کسی دوسرے کے طریقۂ عبادت پر طنز کیا جائے۔ کسی کے مذہب کو گھٹیا اور اُس کے بڑے بزرگوں کو بدنام کیا جائے۔ خود کو اور اپنے مذہب کو افضل ترین کہہ کر دوسروں کو حقیر اور اُن کے مذہب کو باطل کہا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں۔ یہ انسانیت نہیں جہالت ہے۔ گراوٹ ہے۔ بلکہ ذلت ہے۔ بقول گورو گوبند سنگھ جی:۔

ایک پِتا ایکس کے ہم بارک ایک باپ کون ہے:۔

اللہ ہو اکبر۔ ایکمبور۔ ایک اونکار اگر یہ سچ ہے تو یہ لوگ کیوں نہیں سمجھتے کیوں دھرم گرنتھوں کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔ ابھی بھی وقت ہے کہ اُس خدائے پاک اُس پرمیشور۔ اُس واہیگورو کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے نیک راہ پر چلنا شروع کریں۔

ایک بار ایسا کر کے تو دیکھو

گناہوں کا شمار

تختۂ زمین پر گناہوں کا بوجھ بڑھتا جارہا تھا۔ احکام خُداوندی کی کھلے عام خلاف ورزی ہو رہی تھی۔ مگر خُدائے تعالیٰ خاموش تھا۔ وہ فرشتے جنہیں گناہوں کے اعداد وشُمار اور انتظامیہ کارروائی کا کام سونپا ہوا تھا۔ اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ خود گناہ کرنے والے حیران وششدر تھے کہ باوجود ان کے خودسر ہونے کے بھی اُن کے خلاف کارروائی نہیں ہورہی تھی یا اگر ہوتی تھی تو اُن کی توقع سے کہیں کم۔ بیچاری زمین گناہوں کے بوجھ سے دبی جارہی تھی فضا مکدر ہوچکی تھی اور خُدا کے فرمانبردار بیٹے بیٹیاں آنکھیں اُٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مگر خدائے تعالیٰ اُن کی دعاؤں پر دھیان نہیں دیتا تھا۔ اِس عالم میں خُدا یا سردرِکائنات کی قدرت سے یقین اُٹھ جانا قدرتی تھا۔ چنانچہ بہت سے کمزور ایمان والے لوگ گمراہ ہو رہے تھے کچھ پختہ ایمان والوں کے یقین متزلزل ہو رہے تھے۔ ہم سے یہ بے انصافی نہ دیکھی گئی۔ سوچا کیوں نہ عالم خیال میں منتظمانِ دنیا سے ملاقات کی جائے حقیقت کا پتہ لگایا جائے اور اگر ہوسکے تو خاص طور پر اُس خصوصی فرشتہ سے بات چیت کی جائے جو گناہوں کے حساب کتاب کا ذمہ دار ہے اور خداوندکریم کو اِس بارہ میں مطلع رکھتا ہے۔

چنانچہ عالم خیال میں ہم فرشتۂ اجل کے دفتر میں پہنچ گئے۔ اُنہوں نے جلد ہی ہمیں اپنے ایک خاص ماتحت فرشتے کے پاس بھیج دیا جس کے پاس دُنیا میں ہو

رہے گناہوں کا ریکارڈ موجود تھا۔ اُس فرشتے نے اوّل تو ہم سے کلام کرنا بھی پسند نہ کیا مگر جب فرشتۂ اجل کا حوالہ دیا گیا تو اُنہوں نے ہمیں گفتگو کی اجازت دے دی۔

ہم: جنابِ عالی۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ہم اُس دنیائے فانی سے قبل از رحلت عالمِ تخیل میں آپ کے پاس پہنچے ہیں۔ ایک تجسّس دل میں ہے جس کا اعادہ آپ سے کرنا ہے۔ مختصراً آپ سے یہ پوچھنا ہے کہ جو گناہ تختۂ زمین پر ہو رہے ہیں کیا وہ آپکے نوٹس میں نہیں آتے اور اگر آتے ہیں تو کیا آپ فرشتۂ اجل کی معرفت اللہ تعالیٰ کے حضور میں رپورٹ پیش کرتے ہیں یا نہیں؟

فرشتہ: دیکھئے انسان صاحب۔ یہ مُعاملہ نہایت خُفیہ قسم کا ہے۔ موت سے پہلے کوئی مادی دنیا کا باشندہ ایسا ریکارڈ نہیں دیکھ سکتا۔ پھر موت کے بعد میں وہ صرف اپنے گناہوں کا حساب دیکھ سکتا ہے۔ آپ جیسا مقدمہ پہلی بار پیش ہوا ہے۔ موت سے پہلے یہاں آدمی کا گذر نہیں ہو سکتا بہر کیف آپکی جرأت کی داد دیتے ہوئے آپ کے سوال کا جواب دے رہا ہُوں۔

"دنیا میں ہر فردِ بشر کے گناہوں کا حساب رکھنا از حد ضروری ہے۔ مگر ہم تو وہی اندراج متعلقہ ریکارڈ میں کرتے ہیں۔ جنکی رپورٹ ہمارے پاس پہنچتی ہے۔ اب جو اطلاع ہم تک نہ پہنچے اُس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ یا جو گناہ ماتحت عملا کی طرف سے چھپایا جائے یا تخفیف کے ساتھ پیش کیا جائے اُس پر بھی ہم ضابطہ کارروائی ہی کر سکتے ہیں۔ اِس طرح ہماری رپورٹ جو فرشتہ اجل کی معرفت قادرِ مطلق کے پاس پہنچتی ہے۔ وہ ایک طرح نامکمل ہوتی ہے جس سے صحیح تصویر پیش نہیں کی جا سکتی۔ چونکہ صحیح تصویر خُدا تک نہیں پہنچتی وہ کسی آئینی تبدیلی کا حُکم صادر نہیں فرماتے۔ اب آپ پوچھیں گے کہ آخر گناہوں کو کیوں چھپایا جاتا

ہے یا تخفیف کے ساتھ کیوں پیش کیا جاتا ہے. سو اِس کا جواب یہ ہے کہ گنہگار لوگ اکثر چھپ کر گناہ کرتے ہیں۔ چھپے ہُوئے گناہ منظر عام پر کیسے آسکتے ہیں جہاں تک تخفیف گناہ کا تعلق ہے اس میں کچھ بھید ہے. کیا بھید ہے. یہ بڑا خفیہ راز ہے جس کے بارے بتلانے کی ہمیں اجازت نہیں۔ اُمید ہے آپ بلا وجہ ہمیں پریشان کرنے کی کوشش نہیں کریں گے. پیشتر اس کے ہم کوئی اور سوال کرتے وہ خیالی دفتر بند ہو چکا تھا اور ہم پھر اپنے اصل وجود میں برلبِ سڑک کھڑے آنے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے ۔

خُدا اور مذہب

مجھے مذہب سے چڑ ہے۔ اِس لئے کہ مذہب انسانوں کو ایک دُوسرے سے دُور کرتا ہے۔ ہندو مُسلمان کو غیر سمجھتا ہے اور مُسلمان ہندو کو کافر کہتا ہے عیسائی اور بُدھ بھی تو اپنے مذہب کو افضل ترین سمجھتے ہیں۔ اِن سب سے بڑھ کر نئے مذاہب ہیں جو دوسروں کو بالکل بے وقوف گردانتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب بذات خود ایک ذہنی بیماری ہے جو اچھے بھلے انسان کو انسانیت سے گرا دیتی ہے۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

تمام مذاہب کے گرنتھ میری وحدت کا پرچار کرتے ہیں اور ہر مذہب صرف اِسی بنا پر خود کو دوسرے سے بہتر سمجھتا ہے۔ میرا نام رب العالمیں۔ ایشور یا واہگورو رکھا گیا ہے۔ میں کبھی دنیا کے سامنے نہیں آیا جو لوگ اپنے آپ کو میرے پیغمبر کہہ کر دُنیا کے لوگوں کو کسی ایک خاص راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں دراصل وہ بھی اُسی ذہنی بیماری میں مُبتلا ہوتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ وہ خاص راستہ کسی کو جانوروں کی قربانیاں کرنے کی ہدایت کرتا ہے تو کسی کو بیش قیمت اشیاء کو آگ میں جلانے کی ترغیب دیتا ہے کسی کو بہروپ دھارن کرنے کو کہتا ہے تو کسی کو اپنی اصل صُورت بگاڑنے کی تلقین۔ غرضیکہ مختلف اِنسانوں کو مختلف ڈھنگ پر سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ نہ جانے ایسی سوچیں سوچتے وقت وہ میری وحدت کو کیوں بھول جاتے ہیں۔

میں آپ سب سے مخاطب ہو کر یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں ایک ہی ہوں۔ مجھے صرف اِنسانیت سے پیار ہے۔ میں نے کبھی کسی کو محض اِس لئے زیادہ قریب نہیں سمجھا کہ وہ کسی ایک مخصوص مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ مجھے آپ سب یکساں عزیز ہیں۔

اب وقت آگیا ہے کہ ان مذاہب کے جھمیلوں سے اوپر اُٹھو ایسا کرتے ہی تمہیں میرا اور میری موجودگی کا صحیح احساس ہو جائے گا۔ پھر سب دُوریاں ہٹ جائیں گی۔

خدا بنام انسان

کیا آپ مجھے مٹی کا تودا سمجھتے ہیں جسے جب چاہا گرا دیا اور جب پھر طبیعت آئی تو کھڑا کر لیا؟

سادھ سنگت جی میں اکال تخت ہوں

اکال جس کا کبھی کال نہیں آتا اُس کا تخت۔

پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اکال کا تخت آئے دِن کال گرست ہو۔ گرنا۔ مسمار ہونا۔ ڈھیہ ڈھیری ہونا کال گرست ہونا ہی تو ہے کیا آپ میرے صبر کا امتحان تو نہیں لے رہے۔ میری قوتِ برداشت تو نہیں پرکھ رہے؟

مگر آپ تو انسان ہیں۔ آپ میرا امتحان کیسے لے سکتے ہیں۔ ہاں جب شیطان کا جادو اِنسان پر چل جاتا ہے تو وہ خود کو مجھ سے افضل سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔

یہی اُس کی سب سے بڑی حماقت ہے

مجھے مسمار کرنے اور پھر سے تعمیر کرنے کے کچھ خُدائی اصول ہیں۔ اگر اُن اصولوں کے مطابق میری تسخیر اور تعمیر ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

اُن اصولوں کا نچوڑ یہ ہے کہ میری تعمیر بلا امتیاز مذہب و ملّت نیک نیتی اور رضا کارانہ طور پر کی جائے۔ میری تعمیر پر آنے والا خرچ کسی صورت میں بھی چوری شہ زوری سمگلنگ اور کسی دیگر بد پیشہ سے کمایا ہوا نہ ہو اور راہِ

مولا میں دیا گیا ہو۔ جو مزدور بخوشی خود کام کریں اُن کے کھانے کا انتظام میرے لنگر سے ہو اور جو پیشہ ور مزدور اور معمار کام کریں اُن کو پورا حقِ محنت ادا کیا جائے۔ گویا کہ میری تعمیر سچائی محنت کی کمائی، رضا کاری اور نیک نیتی سے کی جائے انہی صفات کا نام خُدا بھگوان یا اکال ہے۔

ایسی تعمیر شدہ عمارت سچ مچ اکال تخت کہلائے گی

دہشت گرد اور ننّھا فرشتہ

راجستھان کے راجپوت تلاش روزگار میں راجپوتانے کے ریتیلے ٹیبوں کو چھوڑ کر پنجاب کی سرزمین پر پہنچے۔ یہ بات قریب ساٹھ سال پہلے کی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں انگریز کا راج تھا۔ روزی روٹی کے لئے لوگ آزادانہ طور پر ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں آجا سکتے تھے سفر کی سہولیات ایسی نہیں تھیں جیسی کہ آج کل میسر ہیں۔ مزدور پیشہ لوگ اکثر و بیشتر لمبی سے لمبی مُسافت بھی پیدل طے کرتے تھے۔ جن راجپوتوں کا ذکر میں کرنے جارہا ہوں وہ بھی اسی مقصد کے لئے پنجاب کے ضلع امرتسر میں آئے اُن دنوں سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی جیسے کام نہیں چلتے تھے۔ کسان بھی اتنے امیر نہ تھے کہ کسی کو بطور نوکر رکھ لیتے ہاں گندم چنے کی فصل تب بھی بافراط ہوتی تھی لوگ غریب نواز تھے اور مانگنے والے بھی بھوکے نہیں مرتے تھے مگر راجپوت مانگنے سے بھوکے مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ جن لوگوں کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ بھی راجپوت ہی تھے نہایت خوددار اور غیرت مند۔

راجپوتوں کا یہ غریب گھرانہ جب کوئی اور ذریعہ معاش تلاش نہ کر سکا تو انہوں نے خاک چھان کر روزی کمانے کی سوچی یعنی انہوں نے مٹی سے شورہ نکالنے کا کام شروع کر لیا۔ اپنے ہاتھوں سے گہرے کنویں کھودے۔ مرد دور نزدیک سے شورہ ملی مٹی اٹھا کر لاتے اور عورتیں جن میں نو عمر لڑکیاں بھی شامل ہوتیں اپنے نازک ہاتھوں سے

کھردرے رسوں کو کھینچ کر بھاری چکّوں میں پانی نکالتیں۔ پھر مٹی اور پانی کا گھول تیار کیا جاتا اور بالآخر نتھرے پانی کو سکھا کر شورہ نکالا جاتا۔ اس طرح صحیح معنوں میں مٹی چھان کردہ روٹی کی تلاش کرتے۔

قریب ساٹھ برس اسی طرح دن رات محنت کرنے کے بعد انہوں نے کچھ زرعی زمین خرید لی اور ایک اونچی غیر آباد جگہ میں آباد ہو گئے یہی جگہ بعد میں تھیہ ربجاہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ راجپوت فطرتاً مہمان نواز ہوتے ہیں اور ہر آنے جانے والے راہی کو طعام و آرام کی سہولت مہیا کرتے ہیں۔ راجپوتوں کے اس مفلسی کنبہ نے بھی اردگرد کے جاٹ سکھوں میں اپنی خوش اخلاقی اور مہمان نوازی کی دھاک جمادی پنجابی جاٹ سکھ ان کے ایسے سلوک پر بہت خوش ہوئے۔ اور انہوں نے بھی ان کو اپنا سمجھنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ لوگ شیر و شکر ہو کر رہنے لگے۔ ان میں سے بہت سے نوجوان راجپوتوں نے پنجابی سکھوں کی طرح لمبی داڑھیاں اور سر کے بال رکھ لئے ان کے رہن سہن بول چال اور طریقہ عبادت پر بھی سکھوں کا اثر پڑا۔ ایک طرح سے وہ بھی گوروؤں کے پیروکار بن گئے ان کا ایک بوڑھا راجپوت یہ دعویٰ بھی کیا کرتا تھا کہ دسم گورو شری گوبند سنگھ جی مہاراج کو آخری وقتوں میں جب ان کے سنگھ گنتی میں کم رہ گئے تھے تو راجپوتوں نے ہر امداد کی پیشکش کی تھی مگر گوروجی کو عمر نے مزید مہلت نہ دی۔ اس کی نظر میں سکھوں اور راجپوتوں میں قطعی فرق نہ تھا وہ سب یکساں تھے۔ اس بزرگ کی باتوں کا افراد کنبہ کے دلوں پر گہرا اثر ہوا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ ان سکھوں میں مل جل کر رہ رہے تھے۔

جہاں دسوں گوروؤں نے انسانیت کو مذہب مان کر خدا کی وحدت کی تبلیغ کی اور ہندوستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا سے مذہب و ملت اور رنگ و نسل کی بناء پر ہونے والے جھگڑوں کی مخالفت کی وہاں کچھ گمراہ لوگوں نے سادہ لوح پنجابیوں کو غلط راستہ پر چلنے پر مجبور کر دیا سیاست اور غیر ملکی رقابت نے اس آگ کو ہوا دی اور پنجاب

کے خرمن امن کو شعلوں کے حوالے کر دیا۔ مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے نام پر لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ چاروں طرف ہاہاکار مچ گئی حکومت کی ہر کوشش رائیگاں جانے لگی۔ جب آگ بھڑک اٹھتی ہے تو کچھ عرصہ کے لئے بڑے سے بڑے طاقتور فائر برگیڈ بے بس نظر آتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی حالت منتظمان حکومت کی تھی۔ مگر اس طاقتور آگ بجھانے والے انجن کی طرح حکومت نے اپنا کام جاری رکھا۔ جوں جوں حکومت دہشت گردوں کی پکڑ دھکڑ میں کامیاب ہوتی ان کے غیر ملکی آقا کھلے ہاتھوں ہتھیار اور نقد رقومات دے کر نئی بھرتی کرنے میں کامیاب ہو جاتے۔ مذہب اور نام نہاد آزادی کے نام پر ہر انسانیت سوز جرم کو خدمت امت کہہ کر برسرپیکار رہنے کی تلقین کرتے۔ گمراہ نوجوانوں کے منہ لہو لگ جاتا اور اس طرح وہ بھیانک سے بھیانک جرم کرنے سے نہ کتراتے۔ دوسری طرف انہیں یہ ذہن نشین کروا دیا جاتا کہ اگر وہ حکومت کے ہاتھوں میں آ گئے تو انہیں کتوں کی موت مرنا پڑے گا۔ ایسے خیالات ذہن میں لیکر کون سیدھے راستہ پر چلنے کی سوچتا ہے دشمن کی چال کامیاب رہی اور بے قصور نہتے اور مجبور لوگوں پر دہشت گردوں کے مظالم بڑھتے رہے وہ ملیچھتا اور بزدلی کی تہہ تک پہنچ گئے۔

راجپوتوں کا وہ کنبہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے چہرے اور سر کے بال بڑھنے اور گوروؤں کی تعلیم اور طریقہ عبادت اختیار کرنے پر بھی راجپوت ہی کہلاتے تھے بس ایک راجپوت لفظ نے ہی کچھ نام نہاد دہشت گردوں کو اس محنت کش کنبے کی پرامن بستی کی طرف کھینچ لیا۔ ایک اندھیری رات کو جب کہ کنبہ کے بیشتر افراد اپنے کام پر گئے ہوئے تھے اور سوائے چند عمر رسیدہ مردوں۔ بوڑھی عورتوں اور بچوں کے اور کوئی مقابلہ کرنے والا نہ تھا۔ دہشت گردوں کا ایک ٹولہ چینی اسالٹ رائفلیں لہراتا ہوا آ پہنچا۔ جبراً سب کو ایک کھلی جگہ اکٹھا کر کے لیٹ جانے کو کہا پھر بے دریغ قتل و غارت شروع ہوئی اور سولہ

مردوں عورتوں اور بچوں کو تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔ سروں اور جسم کے دوسرے نازک حصوں پر کافی قریب سے گولیاں داغی گئیں خون پسینہ سے بنائی بستی مقتل کا نمونہ پیش کرنے لگی پھر ان شیطانوں نے گھروں کی تلاشی لی۔ ایک گھر ایک حاملہ عورت چارپائی پر پڑی ہوئی تھی۔ اسے گھسیٹ کر زمین پر پٹک کے مارا پھر اس کے سر پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ سر کی کھوپڑی کسی مٹی کے برتن کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ پھر اس کے بڑھے ہوئے پیٹ پر یہ کہہ کر گولی چلا دی گئی کہ کہیں بچے میں دھڑکن نہ رہ جائے۔ ایک دوسرے گھر میں ایک رنگلے پلنگ پر ایک چار ماہ کی بچی گولیوں کی دندناہٹ سے بے خبر سو رہی تھی۔ اس کا باپ فوج میں ملازم تھا جو اسی دن ہی سالانہ چھٹی گزار کر واپس گیا تھا۔ پلنگ کے پاس دیوار پر شری گورو گوبند سنگھ جی مہاراج کی تصویر نہایت آب و تاب سے آویزاں تھی۔ بچی کی ماں اس تصویر کی نگہبانی میں اسے چھوڑ کر خود مارے خوف کے بے ہوش ہو چکی تھی۔ ان ظالموں کو اس معصوم زندگی کا سانس لینا بھی ناگوار گزرا۔ سوئی پڑی بچی کی فراک اٹھا کر عین اس جگہ گولی ماری گئی جہاں دل کی دھڑکن محسوس ہوئی پھر وہ فراک اس گولی کے سوراخ پر کر دی گئی جب پولیس اور پریس والے اس جگہ پہنچے تو دیکھنے پر وہ بچی گہری نیند سوئی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی درد کسک یا اذیت کے آثار نہ تھے بلکہ اس پتلے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی لکیر تھی اور چہرے پر چمک تھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان ظالموں کی کم ظرفی پر مسکرا رہی تھی اس طرح وہ انسان دشمن ٹولا اٹھارہ جانوں کو تلف کر کے فاتحانہ انداز میں ہوا میں گولیاں چلاتے اندھیرے میں غائب ہو گئے دور افتادہ مقام ہونے کی وجہ سے مقامی پولیس کو صبح اطلاع پہنچی سینئر و جونیئر افسران جائے واردات پر پہنچے۔ ملاحظہ موقعہ کیا۔ استعمال شدہ گولیوں کے خول اکٹھے کیئے۔ نقشہ جات صورت حال مرتب کر کے نعش ہا کا بعد از مرگ معائنہ ڈاکٹری کروایا اور پھر لاشوں کا بھرا سرکاری ٹرک اس

بستی میں پہنچا ایک بار پھر چیخ و پکار نے آسمان کا سینہ چھلنی کردیا۔ افسران پولیس و دیگر سیول اہلکاران نے ازراہ ہمدردی لاشوں کو نذر آتش کرنے کے لئے ایک بہت بڑی چتا تیار کردی۔ معمولی رسومات کے بعد ان خاموش شہیدوں کو آخری سلام کہنے کے بعد آگ دکھادی گئی چشم زدن میں اٹھارہ انسانی قلبوت دھائیں دھائیں کر کے جلنے لگے۔

ایک ہی رات میں اور وہ بھی ایک ہی کنبے کے اٹھارہ افراد کے قتل کی منحوس خبر ملک کے طول و عرض میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ایوان حکومت لرز اٹھے ہر فرقہ نے اس مذموم فعل کی مذمت کی سیول حکام اور محکمہ پولیس نے اس شیطان چوکڑی کو پکڑنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگادی دن رات کمانڈو دستے کمر کسے ان سانپ کے بچوں کی تلاش میں کوشاں رہتے آخران کی کوشش کامیاب ہوئیں۔ ایک دو پہر وہ دہشت گردوں کا ٹولہ ایک گشتی دستے سے ہتھیار چھیننے کی غرض سے حملہ کر بیٹھا۔ ہوشیار کمانڈر نے وائرلیس پر افسران بالا کو اطلاع دے دی۔ آنکھ جھپکتے ہی پولیس اور پیرا ملٹری فورس کی گاڑیاں پہنچنے لگیں اس دوران ایک سی آر پی کا جوان گھات لگا کر ہوئے حملہ سے شہید ہوچکا تھا سی آر پی اور پنجاب پولیس کے افسران نے اس طریقہ سے گھیرا ڈالا کہ دشمن ایک بڑے مکان میں گھس کر جانیں بچانے کی سوچنے پر مجبور ہو گئے دشمن نے اس مکان سے پولیس پر بے تحاشہ فائرنگ شروع کردی جواب میں پولیس کی گولیاں بھی اس مکان پر برسنی شروع ہو گئیں ۹ گھنٹے مقابلہ چلتا رہا۔ پھر شاید دشمن کے پاس ایمونیشن ختم ہونے کو تھا انہوں نے اندر سے ہتھ گولے پھینکنے شروع کردیئے ادھر پولیس اور سی آر پی ایف کے جوان جاں بکف ٹکر لے رہے تھے گولیوں اور گرنیڈوں کے چلنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے غصہ میں آسمانی بجلی رہ رہ کر کڑک رہی ہو اور اٹھنے والا دھواں فضا میں پھیلے ہوئے

سیاہ بادلوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔ ایسے میں اس ننھے فرشتے کی مسکراہٹ کس کو یاد آ سکتی تھی مگر جونہی یہ پتہ چلا کہ یہ وہی گروہ تھا جس نے اس نہتے راجپوت کنبہ کو تڑپا تڑپا کر مارا تھا سارے افسران اور جوانوں میں ایک نیا جوش ابھر آیا اس کنبے کے قتل کے ساتھ اس چار ماہ کی معصوم گڑیا کی نہایت بے رحم طریقہ پر ہوئی موت کی یاد آنا قدرتی تھا اس بچی کے مردہ چہرہ پر زندہ مسکراہٹ کی لکیر ایک الٰہی نور کی نشانی تھی جو خود بخود ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے آ گئی پھر کیا تھا ایک بار نئے جوش اور ولولے سے حملہ ہوا۔ مکان کے اندر گھرے ہوئے شیطان نے خود ہی تیل ڈالکر اس کے ایک حصہ کو آگ لگا دی ان کا مقصد تھا کہ جلتے ہوئے مکان کو دیکھ کر پولیس والے دور ہو جائیں گے۔ اور وہ اس کا فائدہ اٹھا کر بھاگنے میں کامیاب ہو جائیں گے اندھیری رات اور گنے کی فصل ان کو پناہ مہیا کریں گے۔ مگر پولیس والے کون سی گولیاں کھیلے تھے انہوں نے جہاں گھیرا وسیع کر دیا وہاں مزید گرنیڈان جلتے ہوئے کمروں کی طرف پھینکے آگ نے سارے مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اندر سے گولیوں کے ساتھ دردناک آوازیں بھی آنی شروع ہو گئیں اس گروہ کے قریب آدھے ممبر آگ کی تپش اور گرنیڈوں کے ٹکڑوں سے زخمی ہو کر اندر ہی تڑپ کر مر گئے جو کچھ زخمی حالت میں بھاگنے کی کوشش کرنے لگے وہ فورس کے نشانہ بازوں نے وہیں ڈھیر کر دیئے اس طرح اٹھارہ بے قصور مرد عورتوں اور بچوں کو تڑپا کر مارنے والے گروہ کا تڑپ تڑپ کر خاتمہ ہوا۔ اس ننھے فرشتے کے چہرہ پر مسکراہٹ کی لکیر نے زندگی کی بے ثباتی کو ثابت کر دیا راجپوتوں کا وہ خاندان ابھی بھی اس ٹیلہ پر آباد ہے ؎

ہم کدھر جارہے ہیں

گھروں میں ماتا جی، پتا جی، اور بہن جی کی جگہ ممی ڈیڈی اور سسٹر۔ اسکولوں میں گورو جی اور ماتا جی کی بجائے سر، اور میڈم ۔ اور اسی طرح سڑکوں پر نمسکار کے ستھان پر ہیلو، یا ہیلو جی کا استعمال کچھ اس انداز سے کیا جاتا ہے۔ کہ اپنی تہذیب بھولی بسری یاد معلوم ہوتی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ ماتا جی اور پتا جی جیسے پوتر الفاظ کو پرانے سمبودھن خیال کیا جاتا ہے۔ جبکہ ممی اور ڈیڈی جیسے روکھے اور غیر جاذب ناموں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ انکل اور آنٹی کے بارے میں تو یہ سمجھ ہی نہیں آتی کہ چچا ہے یا ماما۔ تایا ہے کہ پھوپھا آخر ہے کون؟ بس انکل سے ہی سب کام نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح آنٹی اور برادران لا وغیرہ کی حالت ہے۔ پھر بھی ہماری نئی پود اور اپنے آپ کو ترقی پسند (ایڈوانسڈ) خیال کرنے والے لوگ اپنے گھروں میں اسی تبدیلی کو پاکر پھولے نہیں سماتے۔

اب لیجئے تعلیم و تربیت اور تہذیب کی بات ہم مانتے ہیں کہ کسی بھی غیر ملکی زبان کی واقفیت اور علمیت ایک قابلِ تعریف بات ہے۔ مگر یہ کہاں کی شرافت ہے کہ کسی پر رعب جمانے کے لئے غصہ میں انگریزی میں اوٹ پٹانگ باتیں کہہ دی جائیں یا مصافحہ کے وقت ہی انگریزیت کا ثبوت دیا جائے آخر اس کا مقصد کیا ہے؟

لباس کے معاملہ میں تو ہمارے لوگ بہت آگے بڑھ چکے ہیں۔ مغربی لباس کو کچھ اس انداز سے اختیار کیا گیا ہے کہ "اپنا پن" بالکل ختم ہوگیا ہے۔ ہمیں کوٹ پینٹ اور ٹائی سے تو چڑ نہیں مگر جس لباس سے نیم عریانی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر اُس سے کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اگر مطلب محض نمائش ہی ہے تو ہم اسے بلا جھجک بے شرمی کا نام دیں گے۔

شخصی بناؤ سنگار اور زیبائش ہندوستان میں مغربی تہذیب آنے سے پہلے بھی تھے۔ مگر کیا کنوارے پن میں نیچرل لپ اسٹک اور خوبصورتی بڑھانے والی اسی قسم کی دوسری چیزیں سماجی طور پر ممنوع نہیں تھیں؟ پھر یہ کھلے ہوئے بال تو شاید تب دیکھے جاتے تھے جب کسی کے گھر میں موت ہو جاتی تھی۔ یا شمشان گھاٹ پر نہانے کے بعد عورتیں گیلے بال ڈھیلے چھوڑ دیتی تھیں مگر اب تو کھلے بازاروں میں کھلے بال فیشن کا درجہ پا چکے ہیں۔ اور بھی تو بہت نرالے ڈھنگ ہیں بال سنوارنے کے، پھر یہ کھلا پن کیوں؟ شاید اس لئے کہ ہر فیشن پرست اپنے حُسن میں زیادہ جاذبیت پیدا کرنا چاہتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ اس دعوتِ نظارہ پر آنکھیں بند رکھیں؟

یہاں ایک شاعر کا شعر یاد آتا ہے کہ ؎

سبھی مجھ کو یہ کہتے ہیں کہ نیچی رکھ نظر اپنی
کوئی اُن سے نہیں کہتا نہ نکلو یوں عیاں ہو کر

ان حالات میں اگر شارع عام چھیڑ خانی نہیں ہوگی، تو اور کیا ہوگا ——؟

بات بدلتی ہوئی تہذیب کی چلی ہے۔ تو ذرا دورِ حاضر کی فلموں پر بھی نظر کیجئے۔ شاید ہی کوئی ایسی فلم ہو جس میں فضول کی رومانی کہانی لچر گانے اور ڈائیلاگ نہ ہوں فلم دیکھنے والے لڑکے لڑکیاں ان درسگاہوں سے حسن و عشق کے اسباق حاصل کرتے ہیں۔ اور کھلے عام ان ترکیبوں کا استعمال ہوتا ہے۔ حکومت اور فلم ساز ادارے اپنی شہرت اور

اور دولت کے لئے ایسی گراوٹ کو "بزنس" کا نام دے کر اپنے دلوں کو تسلی دے لیتے ہیں ــــ

تہذیب کا رہا سہا جلوس دیسی و انگریزی شراب میں بہا جارہا ہے۔ کس فراخ دلی سے ملک کے رہنما شراب خانہ خراب کو مقبول بنا رہے ہیں۔ جہاں ایک شہر، یا بہت سے دیہات میں ایک ٹھیکہ ہوتا تھا۔ اب عوام کی سہولت کے لئے گلی گلی، اور موڑ موڑ پر ٹھیکہ جات کھول کر ملک کی ترقی کو چار چاند لگا دیئے گئے ہیں شاید اس لئے کہ شراب کی بکری سے بہت سی رقم اکٹھی ہوتی ہے۔ جس سے حکومت کئی تعمیری کام کر سکتی ہے ــــ ان حالات میں کوئی بھی ہندوستانی تہذیب کو ماننے والا شہری سوال کر سکتا ہے کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

آدم خور

ایک خرگوش کے بچے نے جونہی اُچھلنا کُودنا چُھنگیاں اور جست بھرنا سیکھا تو اُسے یہ غلط فہمی ہو گئی کہ وہ کافی طاقتور ہے۔ اپنے جسم میں بجلی کی سی پھرتی کا احساس کرتے ہوئے اُس نے اپنی ماں کو کہا کہ چونکہ وہ خوب اُچھل کود سکتا ہے اور تیز رفتاری سے دوڑ سکتا ہے بھلا وہ کس سے کم ہے۔ وہ بھی دوسرے جانوروں کی طرح شکار کھیلے گا۔ خرگوش کی ماں نے اُس کی پیشانی چومتے ہوئے بتلایا کہ بیٹا جہاں شیر، ببر شیر، چیتے، بھیڑیئے اور لکڑ موجود ہیں وہاں اُسے کون شکار کھیلنے دے گا۔ بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی جان کی امان پانے اور اپنے آپ کو خونخوار درندوں سے محفوظ سمجھنے میں غنیمت سمجھے۔ کہتے ہیں وہ خرگوش کا بچہ اپنی والدہ محترمہ کی دلیل کو جلدی سمجھ گیا اور اُس کا حکم بجا لاتے ہوئے اُس نے شکار کھیلنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سوچا اگر وہ سچ مچ شکار پر نکل پڑتا تو یقیناً جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا چلو جان بچی لاکھوں پائے۔ گھر کے بدھو گھر کو آئے۔

شیر چیتے بھیڑیئے اور لکڑ قریب قریب ہر جاندار کا شکار کرتے ہیں۔ وہ موقع ملنے پر آدم کی اولاد کے لہو سے بھی منہ رنگنے سے گریز نہیں کرتے۔ جو ایسا کرتے ہیں اُنہیں آدم خور کہا جاتا ہے۔ جانوروں کے شکار میں اور دو ٹروں کے شکار میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اسی طرح شیروں چیتوں بھیڑیوں لگڑبگھوں اور انتخابی اُمیدواروں اُمیدواروں میں بھی کوئی فرق نہیں بلکہ موخرالذکر آدم خور ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ

یہ دوسروں کا شکار کرتے ہیں اور دو ٹہ گدھے گھوڑے یا گائے بھینس تو ہوتے نہیں وہ تو کلیتہً آدم ہوتے ہیں۔ اِس سے ثابت ہوا کہ وہ آدم خور ہیں۔

ہماری جمہوریت یا لوک راج میں ایسے درندوں یا آدم خوروں کی کمی نہیں۔ اُدھر الیکشن کی گھنٹی بجی ادھر یہ آدم خور میدان میں پہنچنے لگے۔ جناب ایک دفتری یا چپڑاسی کے لئے تو مڈل پاس ہونا ضروری ہے مگر ان آدم خوروں کے لئے کوئی تعلیمی معیار مقرر نہیں جیسے درندوں اور خونخوار جانوروں کے لمبے لمبے دانت ناخن اور نوکیلے پنجے ہوتے ہیں اُسی طرح اِن آدم خوروں کے پاس دولت کے دانت اور غنڈوں بدمعاشوں کی شکل میں پنجے ہوتے ہیں۔ جس آدم خور کے پاس یہ ہتھیار زیادہ مضبوط ہوں گے وہ دوسروں پر سبقت لے جائے گا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ خرگوش نما امیدوار کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جن کے دودھ کے دانت اور گھاس کے تنکے اکھاڑنے والے ناخن ہیں بھلا وہ کیا شکار کھیلیں گے۔ ہماری مراد اُن امیدواروں سے ہے جو غریب اور بے یار و مددگار ہیں۔ وہ کس کے بل بوتے پر امیدوار بن بیٹھتے ہیں۔ ایک طرف وزیروں کے پوتے۔ دوہتے۔ راجے مہاراجے، بڑے بڑے زمیندار کارخانہ دار اور سمگلر یعنی شیر ببر، شیر، چیتے، بھیڑیئے اور لکڑ بگھے ہیں اور دوسری طرف غریب شوشل ورکر، اخبار نویسوں کے بیٹے اور پسماندہ لوگوں کی اولاد۔ یہ کسی صورت بھی خرگوش کے بچوں سے بہتر نہیں۔

سُنا ہے ایک بار ایک خرگوش نے ایک بڑے شیر کو گہرے کنوئیں میں عقل کی مدد سے گرا دیا تھا۔ اسی طرح اِس سے پہلے کنوئیں کھودنے والے اور جمنا تیر کر پار کر کے پڑھنے جانے والے اِس جمہوریت میں آفتاب و مہتاب بن کر آسمانِ سیاست پر چمک چکے ہیں۔ مگر موجودہ خرگوش کے بچوں کو ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنی جان کی امان پائیں کیونکہ بمصداق مثل ایک تو سے

روٹی کیا چھوٹی کیا موٹی" سبھی ایک جیسے ہیں، اور اُن کا مقابلہ ہے آدم خوروں سے۔ وہ بھی شیر جو ایک تو شیر دوسرے بکتر پہنے۔ اِن خرگوش کے بچوں کی ایک ہی ٹھوکر سے آنکھوں کی چربی اُتر جائیگی۔